Scanned with CamScanner

دورنگی

عابد میر

کتاب .... دورنگی

مصنف .... عابد میر

موضوع .... کہانیاں

اشاعت 2021ء

قیمت 400روپے

زیر اہتمام:

مہردر

ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ

mehirdar@gmail.com

0333-7832323

علم وادب

پبلشر اینڈ بک سیلر

بک مال، تھرڈ فلور، دکان نمبر 311

اردو بازار، کراچی

رابطہ۔ 0335-7466580

www.ilmoadabpublishers.com

دنیا کی دورنگی میں،

اپنا رنگ بچائے رکھنے والوں کے نام!

ایک طرف سے ریشم اوڑھے
ایک طرف سے ننگی ہے
یہ دنیا دو رنگی ہے!

ساحرؔ لدھیانوی

ترتیب

پہلا رنگ

دوسرا رنگ

پہلا رنگ

الفاظ کا احتجاج

یہ الفاظ کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس تھا۔

دنیا کے لگ بھگ سبھی اہم و معتبر الفاظ 'لغت گھر' میں منعقد ہونے والے اس اجلاس میں شریک تھے۔ الفاظ کا یہ اجلاس ہنگامی بنیادوں پر منعقد کیا گیا تھا۔ موضوع چوں کہ نہایت حساس اور انتہائی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے حرف کے قبیلے کے لگ بھگ سبھی معزز الفاظ نے شرکت کر کے اجلاس کو پُر وقار بنا دیا تھا۔

''معزز احباب!'' لفظ 'میزبان' نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اجلاس کا آغاز کیا: ''حرف قبیلے سے وابستہ ان تمام احباب کا شکریہ جو آج کے اس خصوصی اجلاس میں شریک ہوئے۔ جیسا کہ آپ سب کے علم میں ہے کہ آج کے اس اہم اجلاس کا مقصد انسانی سماج کے ہاتھوں لفظ کی پامالی کے خلاف ہونے والا احتجاج ریکارڈ کروانا ہے۔ اس ضمن میں آپ معتبر الفاظ کی رائے ہمارے لیے نہایت اہم ہوگی۔ اس کے علاوہ ہماری خواہش ہوگی کہ مؤثر احتجاج کے حوالے سے ہم اس اجلاس کو نتیجہ خیز اختتام دے سکیں۔''

میزبان نے یہاں ایک ثانیے کو توقف کیا اور پھر کہا، ''میں اب گزارش کروں گا جناب ارتقا سے کہ وہ شرکا کو آج کی محفل کے پس منظر سے آگاہی دیں۔''

ارتقا نامی بزرگ لفظ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر گفت گو کا آغاز کیا، ''معزز ساتھیو، آپ

سب کا شکریہ کہ آپ نے آج حرف کے قبیلے کو درپیش ایک انتہائی اہم مسئلے پر اتحاد کا ثبوت دیا، میں امید کرتا ہوں کہ اسی طرح آپ اس مسئلے پر اپنا احتجاج نوٹ کروا کے باشعور ہونے کا بھی ثبوت دیں گے۔ دوستو، یہ درست ہے کہ انسان ہی ہے جس نے سب سے پہلے ہمارے جدِامجد حرف کو دریافت کیا اور اسے گویائی دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسی نے ہمیں جنم بھی دیا۔ ہم اس کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی جنم لے چکے تھے، یوں اس لحاظ سے ہم انسان کی پیدائش سے کہیں پہلے اس کائنات کا حصہ تھے۔ چرند و پرند اپنے تئیں ہمیں اظہار دیتے رہے۔ بلا شبہ انسان نے پہلی بار ہمیں بامعنی اظہار دیا۔ اس کے لیے ہم انسانوں کے آباواجداد کے شکر گزار ہیں۔ اس کا بدلہ ہم نے انسان کو یوں دیا کہ ہم دنیا کے مختلف انسانوں کے مابین ابلاغ کا ذریعہ بنے۔ وہ انسان جو ایک عرصے تک محض اشاروں کنایوں سے ایک دوسرے سے ابلاغ کرتا رہا تھا، ہماری دریافت کے بعد وہ 'بات' کرنے کے قابل ہوا۔ ہم نے انسانوں کی ایک دوسرے سے قربت بڑھائی۔ ان کی مشکلیں گھٹائیں۔ لیکن آج اسی انسان نے جس بری طرح سے ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو پامال کیا ہے، ہمیں دنیا بھر میں رسوا کیا ہے، وہ قابلِ مذمت ہی نہیں، انتہائی شرم ناک بھی ہے۔ آپ میں سے اکثر وہ معزز الفاظ اس اجلاس میں موجود ہیں، جن کی آج انسانی معاشروں میں پامالی کی جارہی ہے۔ الفاظ کا اس حد تک غلط استعمال کیا جارہا ہے کہ ان کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آرام گھر لغتوں میں معنی کی چادر پہنے دبکے پڑے ہیں، جب کہ معاشروں میں ان کا مفہوم بدل کر رکھ دیا گیا ہے۔ ان کی صورتیں بگاڑ دی گئیں ہیں۔ آج ہم اس غیر اخلاقی انسانی رویے کے خلاف بطور احتجاج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ میں انسانوں کے اس رویے کے خلاف اپنے ساتھیوں کے ہر سخت احتجاج میں ان کے ساتھ ہوں۔"

ارتقا کی گفت گو تمام ہوئی، تو میز بان نے اس حوالے سے تمام معزز الفاظ کو اپنی روداد سنانے اور اظہارِ خیال کی دعوت دی۔

لفظ کی ایک نہایت حسین صورت آگے بڑھی۔ اس کا درپن چند آفتاب چند ماہتاب تھا۔ چہرے سے نور چھلکتا تھا۔ سر سے پیر تک گویا ایک سحر سا اس کے وجود میں تھا۔ یہ محبت تھی۔ اس کے دائیں جانب عشق اور بائیں جانب پیار تشریف فرما تھے۔

"مجھے انسانوں سے سب سے زیادہ گلہ ہے۔ اس لیے کہ میں نے انسانوں کو سب سے زیادہ سکون دیا۔لیکن انھوں نے سب سے زیادہ میری بے حرمتی کی۔میرے پیش رو جناب عشق اور ہم عصر دوست پیار،میری اس بات کی حمایت کریں گے کہ انسانی معاشرے میں ہمارا جنم نہ ہوتا تو نوعِ انسانی کب کی فنا ہو چکی ہوتی۔لیکن انھی انسانوں نے ہمارے چاہنے والوں کو ہمیشہ عذاب میں مبتلا کیے رکھا۔انھیں سخت سے سخت سزائیں دیں۔ان پر فتوے لگا کر ان کا جینا عذاب کیے رکھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا،کہ اس سے ہماری معنی اور ہماری قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا تھا،لیکن اب یہ عالم ہے کہ آج کے انسانی معاشروں میں ہر قسم کا حرص و ہوس ہمارے نام پہ روا ہے۔یہ کیا ظلم ہے کہ جنسی مریض اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ہمارا نام لیں،اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے تعلق جوڑنے والے بھی ہمارے نام پہ عیاشی کریں۔انھی کے باعث آج ہم بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔" محبت کا تیز لہجہ اب گلو گیر ہونے لگا تھا۔اس کی پلکیں نم ہونے کو تھیں۔

"جناب والا!ایک وہ زمانہ تھا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے 'مجھے تم سے محبت ہے' جیسا سادہ جملہ بولنے کے لیے پہاڑ جیسا حوصلہ چاہیے ہوتا تھا،بڑے بڑے جری بہادر محبوب کے سامنے اس ایک لفظ کی جرأت اظہار سے کانپ اٹھتے تھے۔کیسی کیسی دعائیں،کیا کیا ریاضتیں کی جاتی تھیں......اور انھی ریاضتوں کے طفیل ہم (الفاظ) خود میں وہ تاثیر پیدا کر لیتے کہ زباں سے نکلتے اور سیدھے دلوں میں اتر جاتے۔ہم نے انسانوں کی ایک دوسرے سے انسیت کو با معنی بنایا۔جہاں محبت کا تذکرہ ہوتا،فضا خوشبوؤں سے معطر ہو جاتی،سخت سے سخت دل آدمی بھی نرم پڑ جاتا،سر گنگنانے لگتے،ہم (پیار،عشق،محبت) نے انسانوں کو زمیں پر رہتے ہوئے جنت کا تصور دیا۔لیکن انھی انسانوں نے ہمارا یہ حال کیا ہے کہ آج کوئی جواں لڑکا کسی دوشیزہ سے کہہ دے کہ 'مجھے تم سے محبت ہے' تو اس پر ہنسی آنے لگتی ہے۔آج ہم انسانی معاشروں میں گھسے پٹے ہو چکے ہیں،ہماری حالتِ قابل رحم ہو گئی ہے۔لوگ ہم پر ترس کھاتے ہیں۔جن کی آنکھوں سے ہی ہوس ٹپکتی ہو،ان کی زباں پر ہمارا نام آئے تو ہم کس کرب سے گزرتے ہیں،کیا انسانوں کو اس کا اندازہ بھی ہے.........."اب محبت کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ واقعتاً رو دی۔اس کے پہلو میں بیٹھے عشق نے کھڑے ہو کر اس کے سر

پہ ہاتھ رکھا، اور شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بٹھایا۔ پیار نے اس کی خوب صورت آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے۔

"میں اپنی سہیلی محبت کی مکمل حمایت کرتی ہوں۔" یہ دوستی تھی، جس نے محبت کی حمایت میں بولنا شروع کیا۔ "محبت کا آغاز اکثر مجھ سے ہی ہوا ہے۔ ہم نے انسانوں میں قربت پیدا کی۔ لیکن آج یہ عالم ہے کہ ہر مفاد پرست ہمارا نام لیتا پھرتا ہے۔ وہ جنھیں کسی کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا ہو، وہ بھی ہمارا ہی نام استعمال کرتے ہیں۔ جنھیں کسی سے ذاتی غرض ہو وہ بھی ہمارا دم بھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی ہم پہ اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ انسان اپنے فاسد جذبات کو کوئی بھی نام دے لیں، براہِ کرم اپنے کالے کرتوتوں پر ہمارے نام کی چادر ڈالنا چھوڑ دیں۔" یہ کہہ کر دوستی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

"بالکل ٹھیک کہا میری بہنوں نے، آپ میری حالت ہی دیکھ لیجیے............" اب لفظ آزادی کی باری تھی۔ "میرے نام پہ کیا کیا کھلواڑ نہیں کیے انسانوں نے۔ جبر کا ہر قانون انھوں نے میرے نام پہ تھوپ رکھا ہے۔ میرے نام پہ انھوں نے ملکوں کے نقشے بدل ڈالے، سرحدوں کی لکیریں تبدیل کر ڈالیں۔ انسانوں کا محض ایک طبقہ اپنے مفادات کے لیے دنیا بھر میں آج تک میرا نام استعمال کرتا پھر رہا ہے۔ جب کہ میں ہر انسان کے وجود میں بستی ہوں، پھر بھی انھوں نے میرے نام پہ بستیاں اجاڑی ہیں۔ میں انسان کی قدیم ساتھی ہوں، اس لیے سادہ لوح انسان میری چاہ میں اپنی جانیں نچھاور کیے چلے جا رہے ہیں، لیکن الفاظ کی پامالی میں ملوث قبیلہ مسلسل ہمارے معنی و مفہوم کو پامال کیے جا رہا ہے۔ میرے دوست اظہار کو میرے ساتھ ملانے (آزادیِ اظہار) کے بعد انھوں نے جو خرافات ہمارے نام پہ کی ہیں، اس سے ہم شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت قابلِ مذمت ہے۔ ہمیں اس کے خلاف سخت سے سخت اقدام لینا ہوگا۔"

آزادی کی بات پر سبھی الفاظ نے یوں اثبات میں گردن ہلائی، جیسے وہ اس سے مکمل اتفاق کر رہے ہوں۔

"میرا خیال ہے، آزادی کے علاوہ انسانوں نے سب سے زیادہ خون میرے نام پر بہایا

ہے۔" یہ لفظ نظریہ کی دہائی تھی۔"میرے ساتھ بیٹھے میرے دوست عقیدہ کو بھی اگر ملا لیں، جیسا کہ اکثر انسان ہمیں ہم معنی کر لیتے ہیں، تو شاید انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ خون ہمارے ہی نام پہ بہا ہے۔ میں نے انسانی زندگی کو بامقصد بنایا، لیکن آج انسانی معاشرے میں مجھے ہی سب سے زیادہ بے مقصد بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ آج کہیں انسان میری موت کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں تو کہیں میرے نام پہ اپنے ہی ہم جنس انسانوں کی لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ سراسر انسانی بدنیتی ہے، جسے میرا نام دے دیا گیا ہے، جس کے باعث مجھ سے پیار کرنے والے بھی اب مجھ سے خائف رہنے لگے ہیں۔ نوخیز ذہن تو اب میرا نام سنتے ہی بدک اٹھتے ہیں۔ یہ ان انسانوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے، جو ہمارے مفہوم کا غلط استعمال کرتے پھر رہے ہیں، اور اس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

نظریے کی بات مکمل ہوئی تو اس کے ساتھ بیٹھا انتہائی وجیہ اور حسین و جمیل لفظ گفت گو کے لیے آگے بڑھا۔ یہ حسن تھا۔

"معزز احباب! جو دُرگت انسانوں نے ہم سب کی بنائی ہے، میری روداد بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ میرے نام پہ انھوں نے عالمی مقابلے شروع کروا رکھے ہیں۔ جہاں مجھے ایسے مخصوص پیمانوں سے ناپا جاتا ہے کہ میں خود شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ حالاں کہ میں اس کائنات کے ذرے ذرے میں شامل ہوں، لیکن انسانوں نے میری چند نشانیاں مقرر کر کے مجھے انسانی جسم میں مقید کرنے کی مذموم کوشش کی ہے، یہ مجھے گوری رنگت، سرخ گالوں، گھنیرے بالوں اور جسم کے نشیب و فراز میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ میری سراسر تذلیل ہے، میں اس کی شدید مذمت کرتا ہوں۔"

"میں اپنے دوست حسن کی بات کی حمایت کرتا ہوں۔ حسن کو پامال کرنے والے وہی ہیں، جنھوں نے میرے نام کو بھی پامال کیا ہے۔" یہ امن تھا، جس نے بات آگے بڑھائی۔"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے محض اپنے ہتھیار بیچنے کے لیے مجبور و بے بس انسانوں پر جنگیں تھوپیں اور پھر نام میرا استعمال کیا۔ دنیا بھر میں یہ جہاں گئے، وہاں بنام امن تباہی پھیلائی۔ حالاں کہ میں سکون کا موجب ہوں، لیکن آج میرے نام پہ ان عالمی طاقتوں نے جو تباہی مچائی ہے، اس کے باعث اب لوگ میرا

اعتبار کرنے کو تیار نہیں......"

"اعتبار تو خود میرا بھی اٹھ چکا ہے بھائی......" یہ بات لفظ اعتبار نے کہی، جس پر محفل میں خوب قہقہہ پڑا اور محفل پر پڑا تناؤ کسی حد تک کم ہوا۔ "انسانوں نے میرے نام پہ ایک دوسرے سے وہ دھوکے کیے ہیں کہ اب کوئی میرا نام سننے کو تیار ہی نہیں۔ میرا تو وجود ہی اب انسانی معاشروں سے مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔"

"نہیں میرے دوست، ہم نے اتحاد کا ثبوت دیا تو ہم باقی رہیں گے، ہمارا مفہوم بدلنے والوں کا وجود مٹ جائے گا۔" لفظ کمٹ منٹ نے اس کی ہمت بندھائی، ساتھ بیٹھی جرأت نے اس کی حمایت کی۔ اتحاد نے محض ایک اثباتی مسکراہٹ پہ اکتفا کیا۔

اتنے میں انصاف چلایا "مجھے ہی دیکھ لیجیے، میرا کیا حشر کر دیا ہے انھوں نے۔ ہر قسم کی بے انصافی میرے نام پہ کی جا رہی ہے۔ طاقت ور حلقوں کی جانب سے میرا نام لینا ہی مذاق بن کر رہ گیا ہے۔"

"تم اکیلے نہیں ہو بھائی، کچھ یہی عالم میرا بھی ہے۔" ایمان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ اس کی بیگم ایمان داری بھی تشریف رکھتی تھی۔ "تمھیں تو ایک خاص طبقے نے پامال کیا ہے، ہم میاں بیوی کو تر ہر ایک نے اپنی قوت کے مطابق لتاڑا ہے۔ ہر قسم کی بے ایمانی ہمارے نام پہ کی جا رہی ہے، اور دھڑلے سے ہمارا نام لیا جا رہا ہے۔ ہر بے ایمان ہمارا دم بھرتا ہے، ہر ریاکار ہم سے یارانہ جوڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو ہمیں خود اپنا وجود مشکوک لگنے لگتا ہے۔"

اُس کی اِس بات پر بھی حاضرینِ مجلس زیرِ لب مسکرائے۔ اتنے میں لہو جیسی سرخ رنگت کا حامل ایک لفظ اپنی نشست سے کھڑا ہوا، اور گفت گو کا آغاز کیا۔ اس کا لہجہ نہایت دبنگ تھا۔ جیسے سر پہ کفن باندھا ہوا ہو۔ آواز میں بھی تاثیر تھی، وجیہہ صورت بھی تھا اور جوشِ خطابت کا بھی ماہر دِکھتا تھا۔ یہ انقلاب تھا۔

"ساتھیو، انسانوں کی الفاظ کے ساتھ زیادتی نے اب تمام حدیں پار کر لی ہیں۔ کیا تقدس ہوا کرتا تھا ہم جیسے الفاظ کا۔ جوان لوگ پروانوں کی طرح رقص کرتے، جھومتے تھے ہمارے نام پر۔

پتنگوں کی طرح اپنی جانیں نچھاور کرنے کو بے قرار رہتے تھے ہم پر۔آج یہ عالم ہے کہ ہر ایرا غیرا ہمارے نام کے سے کھلواڑ کرتا پھرتا ہے۔کسی کو روڈ نالی بھی بنانی ہوتو وہ بھی انقلاب کا نام استعمال کرتا ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو گی بھلا۔ان اٹھائی گیروں نے ہمارا وہ حال کیا ہے کہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، محض لغتوں میں منہ چھپائے رہتے ہیں کہ کچھ تو نام کی لاج رہ جائے۔ اس سے پہلے کہ یہ بے حس اور خود غرض انسان لغتوں میں بھی ہمارا مفہوم بدل ڈالیں، آئیے مل کر اٹھیں اور ظلم و زیادتی کا یہ نظام بدل ڈالیں......"

"انقلاب زندہ باد............" تمام الفاظ نے مل کر نعرہ بلند کیا۔

میزبان نے دیکھا کہ اجلاس سیاسی جلسے کا رخ اختیار کر رہا ہے، اس لیے اس نے فوری مداخلت کی اور یہ کہہ کر سب کو سنجیدگی سے متوجہ کر لیا کہ اب میں آج کے صدرِ مجلس، الفاظ کی دنیا کے معزز لفظ جناب سچ اور ان کی ساتھی سچائی سے گزارش کروں گا کہ وہ اس بابت اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

میزبان کی دعوت پر لفظ سچ نے فخر سے تنی ہوئی اپنی گردن کو کچھ خمیدہ کرتے ہوئے گلہ کھنکار کر گفت گو کا آغاز کیا......"معزز ساتھیو، آپ سب کی آمد اور عزت افزائی کا شکریہ۔دراصل جو احباب آج کی اس مجلس میں شریک ہیں، محترمہ محبت، جنابِ عشق، دوستی، آزادی، حسن، نظریہ، اعتبار، انصاف، ایمان، انقلاب......آپ سب سے ہی ہمارا وجود ہے، آپ کے بنا میرا اور میری ساتھی (سچ اور سچائی) کا کوئی وجود ہی نہیں۔اس لیے آپ کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کو میں خود کے ساتھ ہونے والی زیادتی سمجھتا ہوں۔انسانی سماج نے جو زیادتیاں آپ کے ساتھ کی ہیں، وہ سب دراصل مجھ پر ڈھائے گئے ظلم ہیں۔کوئی ہوس کار محبت کا نام استعمال کرے تو میری روح پر چھید پڑتے ہیں، کوئی ریاکار دوستی کا دم بھرتا ہے تو میں خون کے آنسو روتا ہوں، آمر جب آزادی کا نام لیتے ہیں تو میں تلملا اٹھتا ہوں، کوئی کاروباری ذہنیت کا مالک جب نظریہ کا پرچار کرتا ہے تو جی چاہتا ہے میں اسے سولی پہ لٹکا دوں، حسن کے نام پہ جو کاروبار ہو رہا ہے وہ مجھے جیتے جی مار دیتا ہے، اعتبار کا جنھوں نے بھرم توڑا ہے ان کی گردنیں توڑنی چاہئیں، انصاف کا جو حشر ہوا ہے وہی ان بے انصافوں کے ساتھ

کرنا چاہیے، اور سچ پوچھئے جب کوئی بے ایمان، ایمان کا نام لیتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس زباں دراز کی زباں کھینچ لی جائے، اور جب کسی اٹھائی گیرے کے منہ سے اپنے بھائی انقلاب کی توہین سنتا ہوں تو انگاروں پہ لوٹنے لگتا ہوں...... مگر دوستو، سچ تو یہ بھی ہے کہ خود میرے ساتھ بھی اس انسانی سماج نے کچھ کم نہیں کیا۔ دنیا کے سب سے بڑے جھوٹ میرے نام پہ چھپائے گئے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا بھی میرا نام لیوا ہے۔ ہر جھوٹ پر میرے نام کی چادر چڑھا دی جاتی ہے۔ ہماری بہن روشن خیالی کا عالم دیکھ لیجیے، کیا کیا حشر نہیں ہوا ان کے ساتھ۔ ایسے ایسے متعصب لوگوں نے ان کا نام استعمال کیا کہ کوئی شریف آدمی اب ان کا نام زباں پہ لانے کو تیار نہیں۔ ہماری نہایت سلیقہ مند دوست بی بی جمہوریت کو دیکھئے، تیسری دنیا میں ان کا وہ نام بدنام ہوا کہ لوگوں کو اب ان کے نام سے ہی گھن آنے لگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نوخیز سہیلیاں عزت، غیرت، شرم اور حیا اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ انسانی معاشرے میں ان کا استعمال کم سے کم ہوتا ہے، ورنہ کثرتِ استعمال سے آج ان کی بھی شکلیں پہچاننے کے قابل نہ ہوتیں۔ باقی نیک الفاظ کے ساتھ انسانی معاشرے نے جو سلوک کیا ہے، اس سے بلاشبہ ان کی روحیں شدید کرب کا شکار ہوئی ہیں۔ اور جہاں تک رہی احتجاج کی بات......" سچ نے یہاں پہنچ کر سانس لی تو محفل کی سانس تھم چکی تھی۔ سبھی حاضرینِ مجلس دَم سادھے اسے سن رہے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ صدرِ مجلس سخت قسم کے احتجاج کا اعلان کریں گے۔ اسی لیے تو وہ سب یہاں جمع ہوئے تھے۔ انھیں شدت سے انتظار تھا کہ ان کا پیش رو کس قسم کے احتجاج کا اعلان کرتا ہے...... "میرا خیال ہے کہ......" سچ نے اپنی ساتھی سچائی پر ایک نظر دوڑائی، جیسے کہ اس کی تائید حاصل کر رہا ہو اور کہنے لگا...... "میرا خیال ہے کہ ہمیں اس رویے کے خلاف احتجاجاً اپنے معنی سے بغاوت کر دینی چاہیے، کیوں کہ ہمیں غلط مفہوم میں استعمال کیا جا رہا ہے، اس لیے ہم مفہوم ادا کرنے سے ہی انکار کر دیتے ہیں، اور یہ احتجاج تب تک جاری رہے گا جب تک انسان اپنی غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں میں استعمال کرنا شروع نہیں کر دیتا۔"

معزز سچ کی اس بات پر ہر طرف واہ، واہ ہونے لگی۔ سبھی الفاظ اس رائے سے متفق نظر آئے۔

بالآخر اتفاقِ رائے ہونے کے بعد تمام نیک الفاظ نے اپنے مفہوم کا پیراہن لغت میں چھوڑا اور ننگے بدن لے کر سماج میں نکل پڑے۔ انسانوں نے الفاظ کی زخمی روحوں میں جھانکنا تو درکنار، انھی ننگے الفاظ کو اٹھا کر انھیں اپنی مرضی کے مفہوم کا پیراہن پہنانا شروع کر دیا۔

تب سے سبھی اچھے الفاظ کے حقیقی مفہوم کا پیراہن محض لُغتوں میں پڑا رہ گیا ہے۔

پس نوشت:

اسی مجلس میں ایک نحیف و نزار، چھوٹی موٹی سا نرم و نازک لفظ ایک کونے میں دُبکا بیٹھا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا، تم احتجاج میں شریک نہیں ہو رہے؟

اس نے نہایت معصومیت سے کہا، "انسانی معاشرے نے جب سے مجھے برتنا چھوڑا ہے تبھی سے الفاظ زخمی ہونا شروع ہوئے ہیں، جس روز انھوں نے مجھے اپنا لیا، الفاظ اپنی حقیقی روح کے ساتھ ادا ہونے لگیں گے۔"

وہ لفظ، احساس تھا!!

کتاب چور کی کہانی

کتابیں اُس نے پہلے بھی کئی بار چرائی تھیں لیکن ایسا اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا، جس نے اُسے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ یہ ایک ناممکن سی بات تھی، وہ کسی سے اِس کا تذکرہ بھی کرتا تو کوئی بھی فہمیدہ آدمی اُس کا یقین نہ کرتا، بلکہ اسی کو پاگل قرار دے دیتا۔

آئیے، اس واقعہ کے تذکرے سے پہلے اس کی اپنی کہانی سن لیتے ہیں۔

مطالعے کا وہ بچپن سے شیدائی تھا۔ اُس کے بچپن کے زمانے میں ٹی وی ابھی نیا نیا آیا تھا اور بہت کم گھرانوں میں میسر تھا۔ اس لیے مطالعہ اُس زمانے کی سب سے بڑی اور سستی تفریح تھا۔ بچوں کی کہانیوں اور رسائل سے ہی اُس نے مطالعے کا آغاز کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے عادت اور پھر معمول کی صورت اختیار کر لی۔ عین یہی معاملہ کتاب چوری کے ساتھ بھی ہوا۔ مطالعے کے شغف کے ساتھ کتاب چوری بھی پہلے اُس کی عادت اور پھر معمول بن گئی۔ کئی دوستوں کی کتابیں اس نے اپنی لائبریری میں لا کر جمع کر دیں۔ کالج، یونیورسٹی سے لے کر مختلف اداروں کی لائبریریوں سے جہاں موقع ملتا، وہ کتاب اچک لیتا۔ یہ عادت اس حد تک اس کے مزاج کا حصہ بن گئی کہ اس نے کتاب کی دکانوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیے۔ یوں ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اس کے پاس۔ لیکن ہوا یہ کہ جوں جوں چوری کی کتابوں کا ذخیرہ بڑھتا چلا گیا، اس کی مطالعے کی عادت اسی رفتار سے کم ہوتی چلی گئی۔ گویا اب اس کی اولین ترجیح کتاب پڑھنا نہیں بلکہ جمع کرنا رہ گیا تھا۔

زمانہ طالب علمی میں وہ اس قدر معصوم صورت دکھائی پڑتا تھا کہ کوئی گمان ہی نہ کرسکتا تھا کہ یہ نوجوان چوری بھی کرسکتا ہے۔ وہ تو خیر طویل تجربے سے اس نے اس قدر مہارت حاصل کرلی تھی کہ کبھی رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی نوبت ہی نہ آئی، ورنہ اگر پکڑا بھی جاتا تو کسی کا یقین کرنا مشکل ہی ہوتا۔ پھر اتفاق سے پیشہ بھی اس نے اس قدر مہذب اپنایا کہ کوئی اس پر چوری اور وہ بھی کتاب کی چوری کا الزام لگاتے ہوئے خود ہی شرمندہ ہوجاتا۔ آپ ہی کہیے کسی استاد کے متعلق کوئی آپ سے کہہ دے کہ یہ آدمی کتاب چور ہے تو آپ کیا فوری یقین کرلیں گے؟...... اپنے اس عہدے اور تجربے نے مل کر اس کی اس عادت بلکہ معمول کو خوب بڑھاوا دیا۔ لائبریری اس کا معمول تو تھی لیکن کس مقصد کے لیے، یہ کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔

یہ سوال غیر متعلق ہر گز نہ ہوگا کہ وہ اس عادت میں مبتلا کیوں کر ہوا؟ جب کہ اس کے مالی حالات بھی کچھ ایسے برے نہ رہے تھے۔ اس بدعت کا آغاز ایک اتفاق سے ہوا۔ لڑکپن میں جب وہ کہانیوں کی کتابوں کا شدید شیدائی تھا، اپنے محلے کی دکان سے کہانیوں کی ایک کتاب خریدتے ہوئے اچانک اُس سے یہ حرکت سرزد ہوگئی۔ ہوا یوں کہ جو کتاب اس نے خریدنے کے لیے اٹھائی، اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹی سی کتاب بھی، اسی کتاب کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آگئی، جو اس کتاب کے عین نیچے رکھی ہوئی تھی۔ کتاب کی سائز مختصر اور ایک جیسی ہونے کے باعث اسے اندازہ ہوا، نہ ہی کتاب فروش کو۔ وہ تو گھر آنے کے بعد جب رات کو وہ پڑھنے بیٹھا تو پتہ چلا کہ ایک کتاب کی قیمت دے کر وہ دو کتابیں لے آیا تھا۔ پہلے تو اسے حیرت ہوئی کہ اسے اِس کا اندازہ کیوں کر نہ ہوا، اور کتاب فروش جس کا کام ہی یہی ہے، اس نے بھی دھیان نہیں دیا؟ دراصل وہ کتب فروش کا اس قدر باضابطہ گاہک تھا کہ وہ آنکھیں بند کرکے کتاب اس کے حوالے کردیتا تھا، اس لیے رش میں شاید اس نے غور ہی نہ کیا۔ اس نے طے کیا کہ وہ کل ہی دوسری کتاب اسے واپس کردے گا۔ لیکن پھر کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نیت بدلنے لگی۔ اس نے خود ہی جواز تراشنے شروع کردیے کہ میں نے چوری تھوڑی کی ہے، وہ تو اتفاق سے آگئی تھی، اور اب اگر میں واپس کرنے چلا جاؤں تو کہیں وہ مجھے چور ہی نہ سمجھ لے...... یوں رات دیر گئے تک اس کے اندر یہ کشمکش جاری رہی تاوقتیکہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے چند روز میں اُس نے اِس واقعہ کو معمول کی بات سمجھ کر بھلا دیا۔لیکن ہوا یہ کہ اگلی بار جب وہ کتاب لینے گیا تو ایک کتاب اٹھاتے ہوئے، دوسری کتاب جان بوجھ کر اس کے نیچے کچھ اس طرح چھپا کر رکھ لی کہ نظر نہ آنے پائے۔بس یہ وہ پہلی چوری تھی جس میں اس کے ہاتھ کپکپائے، جسم کچھ لرزا اور پسینے کی کچھ بوندیں اس کے چہرے پر در آئیں۔اس مرحلے سے گزرنے کے بعد پھر وہ کبھی نہ گھبرایا۔بعدازاں تو اس نے اس بابت یہ عجیب وغریب منطق بھی گھڑ لی کہ ایک کتاب خرید کر اس کے ساتھ دوسری کتاب اٹھالینا، چوری نہیں بلکہ کتب فروش کے منافع سے اپنا حصہ نکالنا ہے، جو وہ ہماری ہی جیب سے لیتا ہے۔ایسے کئی خود ساختہ جوازوں نے اسے اِس کام میں مشاق اور پُر اعتماد بنا دیا۔وہ جو کہتے ہیں، پھر کبھی اس نے مڑ کر نہ دیکھا، وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھتا چلا گیا......کتابوں کے ذخیرے میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

عام طور پر وہ سیاسی موضوعات سے متعلق کم ہی پڑھا کرتا تھا۔کہانیوں میں بھی اس کا مطالعہ عمومی نوعیت کا تھا۔بھاری بھرکم چیزیں اُس کے سر کے اوپر سے گزر جایا کرتیں۔اس کے باوجود اس نے دیوانِ غالبؔ، کلیاتِ اقبالؔ اور فیضؔ کے مجموعہ کلام سمیت شیکسپیئر کے ڈرامے بھی جمع کر رکھے تھے۔یہ اور بات کہ انھیں کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔اور تھے وہ چوری کے ہی!

اردگرد کے سیاسی حالات نے کچھ برسوں میں ایسا پلٹا کھایا کہ ہر سو انقلاب کی گونج سنائی دینے لگی۔ایسے میں انقلابی موضوعات سے متعلق تحریریں اور کتابیں بھی خوب چھپنے اور بکنے لگیں۔اُس نے انقلابی موضوعات پر بہت ہی کم پڑھا تھا۔لیکن اب جب ہر مجلس، ہر صحبت میں انقلابی خیالات اور انقلابی شخصیات سے متعلق گفتگو ہونے لگی تو اسے محسوس ہوا کہ اس موضوع پر بھی کچھ پڑھ لینا چاہیے۔

شہر کے معروف کتاب گھر میں اس کا مستقل آنا جانا تھا۔نیز اب وہ ایک معروف استاد بھی تھا۔اس لیے وہ جب بھی کتاب گھر جاتا، اس کی باقاعدہ آؤ بھگت کی جاتی۔لیکن وہ کوشش کرتا کہ رش کے دوران ہی کتاب گھر میں داخل ہو اور اسی رش کے دوران خریداری کر کے واپس نکل آئے، اِس طرح اُسے واردات کرنے میں خاصی سہولت رہتی۔سو وہ اپنی مخصوص حکمتِ عملی کے تحت کتاب گھر

پہنچا۔ایک عام سا ڈائجسٹ خریدنے کے لیے منتخب کیا،اور باقی اپنے 'ہدف' کی دو کتابیں بڑی مہارت سے یوں الگ کر کے رکھ دیں کہ باہر نکلتے ہوئے تیزی سے انھیں کچھ اس طرح سے اٹھا لیا جائے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔یوں بڑی آسانی سے وہ ایک کتاب کی قیمت میں تین کتابیں لے آیا۔

حسبِ معمول کئی روز تک تو نئی کتابیں اس کے مطالعے کی منتظر رہیں۔وہ انھیں کتابوں کے ذخیرے میں رکھ کر بھول ہی گیا تھا۔پھر کل جب اس نے یونھی مطالعے کے لیے انھیں اٹھا لیا تو تبھی یہ واقعہ پیش آیا،جس نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

ہوا یوں کہ جونھی اس نے انقلابی موضوع سے متعلق کتاب اٹھائی اور صفحات پلٹنا شروع کیے،اس پہ حیرت کے در وا ہوتے چلے گئے۔وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتاب کے تمام صفحے خالی پڑے ہوئے تھے۔ان پہ کچھ بھی چھپا ہوا نہ تھا۔وہ حیران رہ گیا کسی کتاب میں پرنٹنگ کی غلطی سے کوئی ایک آدھ صفحہ کبھی کبھار 'بلینک' رہ جاتا ہے،لیکن پوری کی پوری کتاب خالی ہو،یہ کیسے ہو سکتا ہے؟!پھر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کتاب گھر میں کتاب کے صفحے پلٹ کر اس کا جائزہ لیا تھا۔کتاب کی فہرست دیکھ کر ہی تو اس نے اسے اپنے 'ہدف' کے لیے مقرر کیا تھا۔تو اب.........؟؟!!

اس نے چکرا کے دوسری کتاب اٹھائی جو انقلابی شخصیات سے متعلق تھی......اس پہ حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔کتاب کا ٹائٹل بالکل سفید تھا۔حالاں کہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کتاب کے ٹائٹل پہ دنیا کی معروف انقلابی شخصیات کی تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔اس نے بے قراری سے کتاب کے ورق پلٹے......کورے کاغذ،بالکل خالی،بالکل سفید!!

'یہ کیسے ہو سکتا ہے؟!'اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

پھر اچانک اسے ایک اور خیال آیا۔اس نے وہ ڈائجسٹ دیکھنا چاہا جو ان کتابوں کے ساتھ لیا تھا۔وہ واحد کتاب تھی جس کی اس نے ادائیگی کی تھی۔ڈائجسٹ بھی کتابوں کے ساتھ ہی موجود تھا۔اس نے جلدی سے ڈائجسٹ اٹھایا......سرورق پہ ایک خوب صورت دوشیزہ کی رنگین مسکراتی ہوئی تصویر نمایاں تھی،پس منظر میں کچھ خون کے دھبے دکھائے گئے تھے......یہ پُر اسرار کہانیوں کا ایک معروف جریدہ تھا،جسے وہ بہت شوق سے اور باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔

اس نے جلدی سے ورق پلٹے......

فہرست کے صفحات......اداریہ......کہانیاں......تصاویر......

ہر چیز اسی طرح موجود تھی......

'تو پھر......؟'

اس نے ڈائجسٹ ایک طرف پھینکا اور بے قراری سے پھر اُن انقلابی کتابوں کو اٹھا لیا......اور تیزی سے صفحے پلٹنے لگا......

وہی کورے کاغذ اُس کا منہ چڑا رہے تھے!

سر

''کتنی بار کہا ہے تم سے کہ فائل وقت پر تیار ہونی چاہیے، لیکن تم......'' صاحب نے غصے سے جھلاتے ہوئے فائل میز پر پٹخ دی۔''نہ جانے کہاں ہوتا ہے تمہارا دماغ......''

''سر......وہ......!'' اُس کی ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اُس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

''اب کیا وہ......وہ کر رہے ہو......'' صاحب کا غصہ اور بڑھ گیا۔''لے جاؤ یہ فائل اور کل تک مجھے ہر حال میں یہ فائل مکمل چاہیے......سمجھے تم!''

''جی سر!'' اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور فائل سمیٹ کر باہر نکلا۔ صاحب کی ٹیبل سے لے کر دروازے تک پہنچنے میں تو اُسے دس سیکنڈ بھی نہ لگے لیکن دروازہ بند کر کے کپکپاتے قدموں کے ساتھ وہ جب اپنی میز تک پہنچا تو اُسے لگا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہا ہے۔

صاحب کی جھڑکیاں اُس کے لیے کوئی نئی بات تو نہ تھیں لیکن اصل پریشانی اُسے صاحب کی ناراضی پر تھی۔ وہ صاحب کو کسی صورت ناراض نہیں رکھ سکتا تھا۔

''اگر سر ناراض ہو گئے تو ممکن ہے وہ مجھے معطل کر دیں۔ ہو سکتا ہے نوکری سے نکال ہی دیں......؟ پرائیویٹ فرم میں ایک معمولی کلرک کی اہمیت ہی کیا ہے۔ ضرورت مندوں کی قطار لگی ہوئی ہے، کئی اور مل جائیں گے۔''

وہ سوچ رہا تھا......

"اور کچھ نہ کیا تو ممکن ہے کہ تنخواہ میں کٹوتی کر دیں اور یہ نقصان تو کسی صورت برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا، اب بھی خیرات کی طرح ملنے والی تنخواہ میں بمشکل ایک بیوی اور چار بچوں کا پیٹ بھرتا ہے، ان کی ضرورتیں پھر الگ سے......"

ضرورتوں سے ایک دم اُسے یاد آیا کہ آج بیوی کے لیے میڈیکل سٹور سے دوائیں خریدنی تھیں۔کئی دنوں سے اُس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اُس نے جیب سے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی دواؤں کی پرچی نکالی اور کیلکولیٹر سامنے رکھ کر حساب کرنے لگا۔

کُل ملا کر آٹھ سو پچیس روپے کی دوائیں بنتی تھیں ۔اُس نے جیب سے پیسے نکال کر گنے، جو بمشکل مل ملا کر تین سو ستر روپے بنے۔ اُس کی پریشانی دو چند ہوگئی ...... کہ اب کیا کرے......؟ کسی دوست سے کہے......!

"نہیں، نہیں دوستوں سے پہلے ہی بہت ادھار لیا ہوا ہے، اب تو کوئی دے گا بھی نہیں۔"

اُس نے خود ہی اِس خیال کو رد کر دیا۔

پھر کیا کیا جائے؟...... 'کچھ دوائیں کم کر لی جائیں؟' اُس نے خود سے پوچھا۔

"ہاں یہ ہوسکتا ہے۔" خود ہی جواب تراشنے کے بعد ایک بار پھر کیلکولیٹر سامنے رکھا اور لگا جمع تفریق کرنے، ایک دو دوائیں کم کرنے کے بعد بھی رقم پانچ سو ساٹھ روپے بنتی تھی۔

"اب کیا کروں......؟" سوچنے لگا۔

"صاحب سے بات کر کے دیکھوں......؟"

"نہیں، نہیں اُن کا موڈ پہلے ہی خراب ہے!"

"......لیکن...... آخر بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے...... زیادہ سے زیادہ انکار کر دیں گے...... اور کیا ہوگا...... دو چار سو کی تو بات ہے...... اور پھر ایڈوانس مانگ رہا ہوں، اُدھار تھوڑا ہی......!"

اس نے خود اپنی ہمت بندھائی اور تمام تر حوصلہ مجتمع کر کے صاحب کے کمرے تک پہنچا اور دستک دی، صاحب نے سامنے رکھے لیپ ٹاپ سے سر اٹھائے بنا 'یس' کہا تو وہ دبے پاؤں چلتا

ہوا اُن کے ٹیبل تک آیا۔ صاحب کسی فائل کو غور سے پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ میز کے قریب پہنچ کر کچھ لمحے انتظار کرتا رہا' لیکن توجہ نہ پا کر کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔

صاحب نے فائل سے چہرہ اوپر اٹھایا اور عینک کے شیشوں سے جھانکتے ہوئے پوچھا:

''اب کیا ہوا؟!''

''سر...... وہ...... دراصل......'' اُس کی آواز میں لغزش اور بڑھ گئی...... ''بات یہ ہے کہ ......''

''بات کیا ہے کہ...... اب کہہ بھی دو۔'' صاحب نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

''جی، سر...... وہ...... میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ...... میری بیوی کی طبیعت کچھ خراب تھی......''

''تو میں کیا ڈاکٹر ہوں کہ مجھے یہ خبر سنا رہے ہو۔''

''نہیں سر...... اصل میں...... اُس کے لیے دوا لینی تھی...... وہ پیسے کچھ کم تھے سر......''

''تو میں نے کیا میڈیکل سٹور کھول رکھا ہے؟''

''نہیں سر...... میں تو یہ...... کہہ رہا تھا کہ...... اگر کچھ ایڈوانس......''

''اوہ نو......'' صاحب یوں دھاڑے گویا 'ایڈوانس' اُن کی چڑ ہو۔ اُن کی دھاڑ اس قدر خوف ناک تھی کہ وہ سہم کر رہ گیا۔

''تم جانتے ہو کہ تم پہلے ہی پوری تنخواہ ایڈوانس لے چکے ہو۔''

''جی سر......'' وہ منمنایا۔

''واٹ جی سر...... ایک تو کام وقت پر نہ کرو اور اوپر سے ایڈوانس پر ایڈوانس لیتے جاؤ، تم لوگوں کو تو گویا مفت خوری کی عادت پڑ گئی ہے......''

''سوری سر......''

''ناؤ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر''

''یس سر'' اُس نے فوراً تکمیل کی۔

واپس آیا تو قوتِ حوصلہ جواب دے چکی تھی۔ فوراً سامان سمیٹ کر گھر کو روانہ ہوا۔

پریشان صورت لیے گھر پہنچا تو بیوی اسے خالی ہاتھ آتا دیکھ کر چلا اُٹھی۔

"تو تم آج بھی میرے لیے دوائیں نہیں لائے!" وہ گویا تیار بیٹھی تھی۔

"ہاں ہاں تمھیں کون سی فکر ہے میری...... تم تو چاہتے ہی ہو کہ اس بیماری میں ہی مر جاؤں میں، تا کہ جان چھوٹ جائے تمہاری......" اُس نے روایتی انداز میں کوسنے دینے شروع کر دیے:
"ہائے ماں! کس قلاش کے پلے باندھ دیا مجھ کو' جسے نہ میری فکر ہے' نہ میرے بچوں کی...... ہائے ہائے...... میں کہتی ہوں آخر کس مرض کی دوا ہو تم......؟!"

صاحب کی ڈانٹ نے اُسے پہلے ہی مضمحل کر دیا تھا، بیوی کے طعنوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اُس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور وہ اچانک بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑا۔

بیوی نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو پریشان ہو گئی۔

ایک دم مریض سے مسیحا بن گئی اور لگی اُسے بہلانے، کہ بچے بیدار ہو گئے تو باپ کو اِس طرح روتا دیکھ کر کیا سوچیں گے۔

بڑی مشکل سے اس کا رونا بند ہوا تو بیوی کے اصرار پر اُس نے ساری روداد اُسے سنا ڈالی۔

۔بیوی جو، اب تک خود حوصلہ مانگ رہی تھی، اب اُسے حوصلہ دینے لگی۔

"ارے تم نے اپنی محنت کے پیسے ہی تو مانگے تھے کوئی بھیک تو نہیں مانگی تھی کہ انھوں نے اِس طرح تمھیں ڈانٹ دیا، ہوتے میرے سامنے تو خوب سناتی اُنھیں...... تم کہو تو میں اُن سے بات کر لیتی ہوں، آخر وہ بھی انسان ہی ہیں، کھا تو نہیں جائیں گے!"

لیکن اس نے بیوی سے کہہ دیا کہ اِس کی ضرورت نہیں وہ خود معاملات کو سنبھال لے گا۔

بیوی کی باتوں نے اس کی کچھ ہمت تو بندھائی اور وہ سنبھل بھی گیا لیکن جلدی سو نہ سکا، کیوں کہ اس نے ابھی فائل مکمل کرنی تھی۔ کل وہ مزید تذلیل سے بچنا چاہتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے تازہ دم ہو کر دفتر پہنچا اور سیدھا، صاحب کے کمرے کی طرف روانہ ہوا تا کہ فائل پیش کر کے داد حاصل کر سکے۔ شاید اسی طرح کل کی تذلیل کا کچھ ازالہ ہو جائے...... لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب اُسے پتہ چلا کہ آج صاحب آفس آئے ہی نہیں۔ اُسے لگا کہ جیسے اُس کی محنت پر پانی پھر گیا ہو۔ وہ خاصا بددل سا ہو گیا۔ کام میں بھی جی نہ لگ رہا تھا۔ من زیادہ بوجھل ہونے لگا تو دو گھنٹے بعد اُس نے چھٹی لے لی اور گھر جانے کا فیصلہ کر لیا کہ بچوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ وقت بیوی کے ساتھ ہی گزار لیا جائے، شاید اِس سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔

اُس نے گھر کے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا اور ساتھ ہی اُس پر حیرتوں کے در، وا ہوتے چلے گئے۔

''ارے بھئی، تم نے سنجیدگی سے بتایا ہی نہیں کہ تمھاری بیوی کی طبیعت واقعی بہت خراب ہے، وہ تو اُس بے چاری نے مجھے صبح سویرے فون کر کے بتایا، میں نے سوچا آفس جاتے ہوئے ذرا طبیعت معلوم کرلوں ...... اور ہاں، اگر مزید رقم کی ضرورت ہو تو بلا جھجھک بتا دینا...... اچھا اب چلتا ہوں۔''

''تھینک یو سر......!'' اُس کے منہ سے غیر ارادی طور پر مشینی انداز میں یہ الفاظ نکلے۔

آواز جیسے خالی قبر سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

سر آگے بڑھ گئے اور وہ سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا......

کمرے میں پہنچا تو آئینے میں خود کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کا سر، دھڑ سے غائب ہو چکا تھا۔

اُس کی بیوی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی گنگناتی ہوئی گیلے بال سنوار رہی تھی۔

اُس نے بے بسی کے ساتھ، اپنے بنا سر کے دھڑ کو، دھڑام سے بستر پر گرا دیا۔

راستہ

رمضان کے لیے 'رمضان' کا مہینہ بڑی مشکل اور کڑا امتحان لے کر آتا ہے۔ عام دنوں میں تو روکھی سوکھی میں گزارا ہو جاتا ہے لیکن اس مہینے سحر و افطار کے خصوصی انتظامات تو اچھے بھلے آدمی کی کمر توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اوپر سے جوں جوں عید کے دن قریب آ رہے تھے، بچوں کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی بہت ادھار لے چکا تھا۔ سوچ رہا تھا، اس مہینے تنخواہ تو قرض خواہوں میں بٹ جائے گی، عید کیسے ہوگی......؟ بچوں کے نئے کپڑے اور جوتے کہاں سے آئیں گے......؟!

رمضان عرف رمضو ایک سرکاری محکمے میں چپراسی کی ملازمت کرتا تھا۔ جہاں خیرات جیسی معمولی تنخواہ اسے ملتی تھی، جس میں بمشکل گھر کا گزارہ ہوتا تھا۔ اس کے کنبے میں اس کے بوڑھے ماں باپ کے علاوہ ایک بیوی اور پانچ بچے شامل تھے، جن میں دو ماہ قبل چھٹے کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پانچ کا پیٹ پالنا مشکل تھا، اوپر سے ایک اور بچے کی پیدائش نے رمضو کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ مناسب خوارک نہ ملنے کی وجہ سے بچہ بیمار رہنے لگا تھا۔ دواؤں کے پیسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے بھی ہر بار بنا فیس کے علاج سے انکار کر دیا۔ دو ماہ کا بچہ سوکھ کر خشک لکڑی کی طرح ہو گیا۔

''......اور اب بچوں کی خریداری، عید کے کپڑے، یہ سب کہاں سے ہوگا؟ منشی سے پہلے ہی بہت سود لے چکا، اب تو اس نے بھی پہلے سود کی ادائیگی تک مزید رقم دینے سے انکار کر دیا ہے، اب کیا ہوگا؟''

رمضان یہ سب کالونی کے قریبی پارک میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔قریب ہی معروف چوراہا تھا اور سامنے روڈ کی دوسری جانب ٹھیلے والے تھے جو کھانے پینے کی اشیا سے لے کر بچوں کے کھلونے تک فروخت کر رہے تھے۔

اچانک سامنے روڈ پر ایک کار آ کر رکی۔کار سے پانچ،چھ برس کی ایک بچی اپنے والدین کے ساتھ اتری اور فوراً کھلونوں کے دکان کی طرف دوڑی ۔وہ مختلف کھلونوں کی فرمائش کرنے لگی۔اس کے سوٹڈ بوٹڈ والد نے اسے کئی ایک کھلونے لے کر دیے۔کھلونے لے کر جب وہ کار میں بیٹھنے لگے تو ان ایک چھوٹے سے بھکاری بچے نے ان کے آگے آ کر ہاتھ پھیلا دیے۔کار والے صاحب نے فوراً اسے ڈانٹ دیا؛"اے دور ہٹو،سارا شیشہ میلے ہاتھ لگا کر خراب کر دیا۔"لڑکا سہم گیا۔ساتھ بیٹھی عورت نے ایک چھوٹا سے نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا اور کار فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔بھکاری لڑکا ایک نظر نوٹ کو دیکھتا تو کبھی ایک نظر اپنی میلی ہتھیلی پہ ڈالتا۔

رمضان جو پارک کے بینچ پہ بیٹھا سامنے سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا،اس کا جی چاہا کہ کار والے کا گریبان جا کے پکڑ لے اور اس کی بچی کے ہاتھ سے کھلونے چھین کر اس بھکاری لڑکے کے ہاتھ میں دے دے۔'آخر یہ بھی تو بچہ ہے'اس کا بھی تو کھلونوں سے کھیلنے کو جی چاہتا ہوگا'یہ بھی تو کسی ماں کا لال ہوگا'کسی باپ کا لاڈلا بیٹا ہوگا.....'یہ سوچتے ہوئے اس کی چھوٹی لاڈلی بیٹی کی صورت نظروں میں گھوم گئی،جس نے آج ہی اس سے رنگ برنگی چھوڑیاں لانے کو کہا تھا اور اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

اس نے سوچا شام کو جب وہ خالی ہاتھ گھر جائے گا تو اپنی ننھی ی بیٹی کے سامنے کیا جواز پیش کرے گا!کون سا جھوٹ بولے گا ننھے سے دل کو بہلانے کے لیے......ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا ہم جیسے لوگوں کے لیے عید آتی ہی کیوں ہے؟جس طرح امیر اور غریب کی زندگی کے الگ الگ پیمانے مقرر کیے گئے ہیں،اسی طرح عید بھی فقط محلوں اور بنگلوں تک محدود کیوں نہیں کر دی جاتی!

وہ انھی خیالوں میں گم تھا کہ کسی کے رونے کی آواز نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو قریبی چوراہے پر اسے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ وہ کسی کے گرد جمع تھے۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے بے چینی محسوس ہوئی کہ آخر ہو کیا رہا ہے! یہ معلوم کرنے کے لیے پارک سے اٹھ کر وہ ہجوم میں گھس گیا۔ چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت کے سامنے چند ماہ کے بچے کی لاش پڑی ہے اور خاتون بری طرح سے بین کر رہی ہے......"ہائے رے ڈاکٹر مار دیا میرے معصوم کو کوئی رحم نہ آیا تجھے مجھ بڑھیا پر، خدا تجھ سے پوچھے گا، میرے پاس تو اسے کفن دینے کو بھی کچھ نہیں، مسلمانو! رمضان کا مہینہ ہے، میرے معصوم بچے کو کفن دے دو خدا تمہارے بچوں کو زندگی دے گا!" عورت رو بھی رہی تھی اور ہاتھ جوڑ کر لوگوں کی منتیں بھی کر رہی تھی۔ اس کی مسکینی اور صدا سے متاثر ہو کر ہمدردی کے طور پر لوگ اس کی جھولی میں کچھ سکے اور بعض پچاس سے سو تک کے نوٹ بھی ڈال رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اس کی جھولی بھر چکی تھی۔ اتنی دیر میں ہجوم چھٹ چکا تھا۔

رمضان ابھی تک وہیں موجود تھا۔ اس نے ننھی لاش کو غور سے دیکھا۔ ایک پل کو اسے اس لاش میں اپنے بچے کی شبیہ نظر آئی۔ وہ سہم کر رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے جیسے ہی اسے لاش کے قریب روتی ماں کی پیسوں سے بھری جھولی نظر آئی تو ایک دم جیسے اس کے ذہن کا کوئی پٹ کھل گیا ہو۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سارے سوالوں کا جواب اسے مل چکا ہو جیسے راستہ نظر آ گیا ہو!

بے اختیار اس نے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

گھر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آچکا تھا۔

اس نے دیکھا بچے صحن میں کھیل رہے ہیں۔ اُن کی ماں کا پوچھا تو بتایا کہ محلے میں کہیں گئی ہوئی ہے۔ وہ فوراً اندر چلا گیا۔ کمرے میں آ کر اس نے دو ماہ کے ننھے بچے کو دیکھا۔ نقاہت کے باعث جس کے جسم کی ہڈیاں بھی اُبھر آئی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے اس کے جسم پر کوئی دبیز کپڑا نہ تھا۔ بچے کی آنکھیں بند تھیں اور بے خیالی میں انگوٹھا چوستے چوستے اس کے منہ میں رہ گیا تھا۔

رمضان نے جیسے ہی اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھائے، مارے دہشت کے اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ جلدی سے تکیہ اٹھایا اور بچے کے منہ پر رکھ دیا۔ بچے کا جسم لرزنے لگا۔ رمضان نے آنکھیں بند کر لیں۔

دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی بند آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں تک ڈھلک آئے۔ اسے یوں لگا جیسے جب وہ آنکھیں کھولے گا تو بچے کی جگہ یہاں ایک دنبہ پڑا ہوگا!

مگر جب آنکھ کھول کر اس نے تکیہ ہٹایا تو سامنے ننھی لاش مسکرا رہی تھی؛ جیسے اپنی قربانی پہ خوش ہو اور مسکرا کر باپ سے کہہ رہی ہو؛ "ہر باپ کے نصیب میں دنبہ نہیں ہوتا، آپ مایوس نہ ہوں ابا، یہاں نہ سہی جنت میں آپ کو اس کے بدلے ضرور دنبہ ملے گا!"

رمضان نے دہشت زدہ ہاتھوں سے لاش اٹھائی۔ ماتھے پہ ایک بوسہ دیا اور چیختا، چلاتا لاش کو لے کر اسی چوراہے کی طرف دوڑ پڑا، جہاں کچھ دیر پہلے بوڑھی عورت ننھی لاش کے ساتھ بین کر رہی تھی۔

بریکنگ نیوز

[نوٹ :اس کہانی کے اکثر کردار، حالات اور واقعات حقیقی ہیں، بعض کو افسانوی رنگ دیا گیا ہے۔]

'صحافت کا فلسفی!'

اب اِسے اُس کی چڑ کہہ لیں یا وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں 'نِک نیم' یعنی پیار کا نام...... صحافتی حلقوں میں وہ اسی نام سے معروف تھا۔ یا مختصراً فلسفی کہہ دیا جاتا، تو دوست سمجھ جاتے کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے۔

دانش نے فلسفے میں ڈگری لے کر صحافت جوائن کی تھی۔ شاید اسی لیے میڈیا کی چکا چوند اس کے فلسفیانہ جراثیم کو نہیں نگل سکی تھی۔ تبھی یار دوست اسے "صحافت کا فلسفی" یا "فلسفی صحافی" کہہ کر چھیڑتے تھے۔

تھا تو بڑا ہنس مکھ جوان مگر جب کبھی اس پر فلسفہ طاری ہو جاتا تو پھر کئی دن کھویا کھویا اور گم صم رہتا۔ نہ دفتر آتا، نہ پریس کلب میں کہیں دکھائی دیتا۔ موبائل بھی اکثر بند ہی ملتا۔ قریبی دوست جان جاتے کہ فلسفی صاحب اب "موڈ" میں ہے، لہٰذا اسے نہ چھیڑا جائے۔

یہ کیفیت دو چار دن ہی رہتی۔ پھر اچانک پریس کلب کے کینٹین میں اس کی خوش گپیاں سنائی دیتیں۔کسی کونے میں بیٹھا وہ دوستوں کی چھیڑ خانی سے محظوظ ہو رہا ہوتا۔

صحافت کی طرف اُس کے آنے کا قصہ بلوچستان کے اکثر صحافیوں کی طرح کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، جو اِس کوچہِ خرابات میں 'انتخاب' کی بجائے اتفاق سے ہی آنکلے۔(ان کا تو ذکر ہی نہیں جو بحالتِ مجبوری آگئے)، فرق تھا تو بس اتنا کہ اپنے ہم عصر صحافیوں میں وہ ان بہت کم دوستوں میں سے تھا جو باقاعدہ "پڑھے لکھے" صحافی تھے۔اور صحافت میں آنے کے بعد بھی ان کا علم سے رابطہ منقطع نہ ہوا تھا۔

صحافت میں چھ، سات برس گزار کر بھی وہ مطالعے کی عادت سے چھٹکارا حاصل نہ کر پایا تھا۔ تنخواہ لینے کے بعد اس کا پہلا دورہ کتابوں کی دکان کی جانب ہوتا۔اس کی دلچسپی کے موضوعات سے متعلق لگ بھگ ہر آنے والی نئی اہم کتاب اس کے زیرِ مطالعہ ہوتی۔اس کی یہی عادت اُسے اپنے ہم عصروں اور سینئرز میں معتبر بنائے ہوئے تھی۔اس کے وسیع مطالعے کے باعث ہی اکثر اختلاف کے باوجود دوست اُس کے نقطہ نظر کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اُس کی اِس عادت کی جب بھی تعریف ہوتی، وہ اپنے استاد کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولتا، جنھوں نے پہلی بار اسے مطالعے کی جانب راغب کیا اور کتاب سے اس کی دوستی کروائی۔

******

مطالعے کا چسکا اُسے اپنے قصبے کے کالج کے ایک استاد کی صحبت میں لگ چکا تھا۔

میٹرک تک اُس کا مطالعہ بس کتابی کہانیوں تک ہی محدود تھا۔ یہ تو بھلا ہو کالج میں نئے آنے والے انگریزی کے استاد کا، جو صاحب ذوق ثابت ہوئے۔اتفاق سے نام بھی ان کا ذوق ہی تھا۔ ذوق صاحب انگریزی کے صرف استاد نہ تھے، بلکہ جید عالم تھے ۔ وسیع المطالعہ شخص تھے۔بلوچستان میں کالج کے استاد کا پڑھا لکھا ہونا ہی غنیمت سمجھا جاتا ہے۔اپنے مضمون پر جن چند لوگوں کو عبور حاصل ہو، بلوچستان کے محکمہ تعلیم میں ایسے صاحبِ علم چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ذوق صاحب جیسے اساتذہ کا دم غنیمت تھا۔

اس چھوٹے سے قصبے میں تو انھوں نے جیسے انقلاب برپا کر دیا۔ وہ نہ صرف باقاعدگی سے اور بھرپور کلاس لینے والے چند اساتذہ میں سے تھے بلکہ شام کے اوقات میں وہ طلبہ کو انگریزی کی مفت ٹیوشن بھی پڑھایا کرتے۔

دانش جلد ہی ان کے ہونہار اور قریبی شاگردوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے نہ صرف انتہائی دلچسپی سے انگریزی سیکھی بلکہ انگریزی ادب کی کتابیں بھی پڑھنے لگا۔ اس کی دلچسپی کے پیش نظر ذوق صاحب مہینے کے آخر میں جب بھی کوئٹہ جاتے، واپسی پر اس کے لیے اردو اور انگریزی کی دو چار کتابیں ضرور لے آتے۔

لیکن دانش کے مطالعے کی رفتار کچھ ایسی تیز ہوئی کہ پروفیسر صاحب کی لائی ہوئی دو، چار کتابیں وہ ہفتے بھر میں چاٹ لیتا۔ اس کی مطالعے کی اسی بھوک نے اسے کالج لائبریری کی راہ دکھائی۔

کالج لائبریری سال بھر میں بہ مشکل چار دن ہی کھلتی تھی۔ اس لیے اس تک رسائی کے لیے اسے پہلے لائبریرین صاحب کو ڈھونڈ نکالنا پڑا۔ لیکن وہ بھی تب تک پس و پیش سے کام لیتے رہے جب تک ذوق صاحب نے ضمانت فراہم نہ کر دی۔

لائبریری کے ماحول نے پہلے پہل تو دانش کو مایوس کر دیا...... دھول، مٹی سے اٹی ہوئی پرانی کتابیں، نہ بیٹھنے کو کوئی ڈھنگ کی جگہ، نہ کوئی نئی کتاب۔ لیکن اسے کب کسی نئی کتاب کی تلاش تھی۔ وہ تو کسی عادی نشہ کرنے والے کی طرح مطالعے کی لت میں لگ چکا تھا اور اسے بس اپنی لت پوری کرنا تھی۔ سو، کتاب اٹھا کر جو ایک کونے میں بیٹھ جاتا تو لائبریرین کی بارہا یاد دہانی پر بھی تب تک نہ اٹھتا، جب تک متعلقہ باب پورا نہ کر لیتا۔

شروع شروع میں تو لائبریرین کو اس کے آنے سے خاصی کوفت ہوئی۔ اسی کی وجہ سے اس بیچارے کو پہلی بار ڈیوٹی کرنا پڑ رہی تھی۔ لیکن جلد ہی اس کے مطالعے کے انہماک اور کتابوں کو جھاڑ پھونک کر رکھنے کی عادت سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ لائبریری کی چابی اسی کے حوالے کر دی کہ میاں جب جی چاہے، اطمینان کے ساتھ اپنی مرضی سے آؤ، جاؤ۔ بس پرنسپل صاحب تک کوئی شکایت نہ پہنچے۔

دانش کے لیے تو یہ گویا اندھے کو دو آنکھیں مل جانے کے مترادف تھا۔ کلاسیں تو کالج میں ویسے ہی برائے نام ہوتی تھیں، یہ بس ذوق صاحب کی کلاس لے کر جو لائبریری میں گھستا تو شام ڈھلے ہی وہاں سے برآمد ہوتا۔ نہ وقت کا پتہ، نہ کھانے پینے کا ہوش۔ اب یہ اتفاق تھا یا اس کا نصیب کہ کالج کی لائبریری میں کثرت سے فلسفے کی کتابیں ہی میسر تھیں۔ خدا جانے یہ کسی زمانے میں کسی صاحبِ ذوق کا کمال تھا یا مفت، سستی اور بے مصرف کتابیں لا کر جمع کرنے کا لائبریرین کا مقصد، تاکہ کوئی یہاں کا رخ ہی نہ کرے۔ دانش نے لیکن یہ سارا خزانہ چاٹ ڈالا۔ جوں جوں اس کا مطالعہ بڑھتا گیا، اس کی ذہنی دنیا میں اتھل پتھل ہوتی گئی۔ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا اس کا زاویہ نگاہ بدلنے لگا۔ ذوق صاحب کے ساتھ اس کے مباحث طویل ہونے لگے۔

کالج کے انھی چار برسوں میں، اس کی آنکھیں چشمے کی محتاج ہوئیں۔ بھری جوانی میں بال جھڑنا شروع ہو گئے۔ اس کے فکری رجحان کو دیکھتے ہوئے ذوق صاحب نے بی اے میں اسے فلسفے کا مضمون رکھنے کا مشورہ دیا۔ کالج میں فلسفے کا کوئی استاد نہ ہونے کے باوجود، اس نے انگریزی کے علاوہ سب سے زیادہ نمبر اسی مضمون میں لیے تو اس کا سبب ایک طرف جہاں اس کا مطالعہ تھا، تو دوسری طرف ذوق صاحب کے ساتھ ہونے والے اس کے مباحث، جو اکثر گھنٹوں پر محیط ہوتے۔

اس کے اسی نتیجے کو سامنے رکھتے ہوئے ذوق صاحب نے اسے فلسفہ میں ایم اے کرنے پر مائل کیا۔ تین بہنوں اور پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوصف دانش کو ایک طرح سے فارغ البالی تو میسر تھی۔ والدین چوں کہ انتقال کر چکے تھے، اس لیے بھی دیگر بہن بھائی اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بہنیں شادی کر کے اپنا گھر بسا چکی تھیں۔ بھائی سبھی برسرِ روزگار تھے۔ اس لیے مالی مسائل کی رکاوٹ نہ تھی۔ البتہ بھائیوں میں کوئی بھی میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر پایا تھا۔ اس لیے جب چھوٹے بھائی نے اعلیٰ تعلیم کا قصد کیا تو سبھی بخوشی راضی ہو گئے۔ بڑے بھائی نے تو اس کے ماہانہ اخراجات کی بھی حامی بھر لی۔

دانش کے خاندان میں تو خیر کوئی بھی آج تک کالج کی تعلیم حاصل نہ کر پایا تھا، لیکن قصبے سے بھی بہت کم لوگ یونیورسٹی تک جا پائے تھے۔ قصبے کے کالج کو ڈگری کا درجہ ملے ابھی زیادہ عرصہ

نہ ہوا تھا، اس لیے اکثر لوگ انٹر یا گریجویشن کر کے کسی معمولی سرکاری ملازمت پہ لگ جاتے یا کسی کاروبار میں ملوث ہو جاتے۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول، بلوچستان کے اکثر قصبوں کی طرح یہاں ایک خواب ہی طرح تھا۔

اس لیے جب دانش کے کوئٹہ جا کر یونیورسٹی میں پڑھنے کا تذکرہ ہوا تو دُور پار کے دوست عزیز سبھی مبارک باد دینے آئے۔ اس سے بھائیوں کا حوصلہ اور بلند ہوا۔ سب نے بہ رضا و رغبت اور بڑے مان اور خوشی کے ساتھ اسے کوئٹہ رخصت کیا۔

******

دانش اس سے پہلے دو چار بار کالج کے زمانے میں دوستوں کے ساتھ کچھ دن گھومنے پھرنے کے لیے کوئٹہ آیا تھا۔ یونیورسٹی میں یہ اس کا پہلا دن تھا۔ پروفیسر ذوق یہاں بھی اس کے کام آئے۔ یونیورسٹی میں اس کا داخلہ فارم جمع کرانے سے لے کر ہاسٹل میں کمرے کی الاٹ منٹ جیسے جھنجھٹ میں انھوں نے اس کی بھرپور رہنمائی کی۔ یونیورسٹی میں اکثر ان کے شاگرد موجود تھے۔انھوں نے دانش کا خوب خیال رکھا۔ ذوق صاحب کا نام سنتے ہی وہ اس کی آؤ بھگت کرنے لگتے۔جس پر نہ صرف اسے اپنے استاد پر فخر ہوا بلکہ یونیورسٹی کے کئی جھمیلوں سے وہ بچ گیا۔

البتہ شعبہ فلسفہ میں آتے ہی اس کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔

بلوچستان یونیورسٹی کے ایک پُر وقار و پُر ہجوم شعبہ انگریزی کے عین پہلو میں واقع ہونے کے باوجود شعبہ فلسفہ کا عالم کسی اجڑی ہوئی بیوہ جیسا تھا۔ جیسے شہر کے پوش علاقے میں واقع رنگین محلوں کے بیچ کوئی جھونپڑ پٹی، بارونق شادی ہال میں جیسے کوئی کم صورت دوشیزہ جسے کوئی منہ لگانے کو تیار نہ ہو۔ اس لیے دانش پہلے تو پریشان ہوا کہ اس سے زیادہ رونق تو قصبے کے کالج کی کلاسوں میں ہوا کرتی تھی......لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ لگ بھگ پوری یونیورسٹی اور اس کے تمام شعبوں کا یہی عالم ہے۔ بظاہر پُر رونق دِکھنے والے شعبوں میں بھی پڑھائی برائے نام ہی ہوتی تھی۔ اس کا عملی مظاہرہ اس نے یونیورسٹی کے چند اہم اور طلبہ کے لیے 'کامیاب مستقبل' کی ضمانت سمجھے جانے والے ایک شعبے کی کلاس میں بھی جا کر دیکھا۔

ہاسٹل میں اسے جو دو روم میٹ ملے، ان میں سے ایک، ارشاد مستوئی تھا جو فارمیسی میں تیسرے برس کا طالب علم تھا۔ فارمیسی ڈپارٹمنٹ یونیورسٹی کے نوجوانوں کے لیے وقت گزاری کے چند معروف شعبوں میں سے تھا۔ اسے منی کالج بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ یہاں داخلہ انٹر کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک اتنے بڑے بلوچستان میں ایک ہی جنرل یونیورسٹی ہوا کرتی تھی، وہ بھی گریجویشن کی کلاسز نہیں لیتی۔ اس لیے یونیورسٹی کا چہرہ طلبہ کو گریجویشن کے بعد ہی دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دو برس میں اکثر طلبہ کا یونیورسٹی سے جی نہیں بھرتا اور محض یونیورسٹی میں مزید وقت گزارنے کے لیے ان کی اکثریت کسی اور ڈپارٹمنٹ میں برائے نام داخلہ لے لیتی۔

ارشاد مستوئی بھی اس کی طرح چھوٹے سے قصبے سے آیا ہوا تھا۔ اس کے آباؤاجداد بھاگ ناڑی سے پہلے جعفر آباد اور پھر جیکب آباد ہجرت کر گئے تھے۔ اس کے والد نے کچھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں اس لیے وہ تعلیم کی اہمیت سے آشنا تھے۔ مستوئی کا بڑا بھائی ڈاکٹر تھا اور یہیں کوئٹہ میں رہتا تھا۔ مستوئی زیادہ تر ان کے گھر پر ہی رہتا، مگر کبھی کبھار ہاسٹل کئی دن ہاسٹل میں پڑا رہتا۔ شعر و ادب کا شائق تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے آبائی شہر سے 'منزل' کے نام سے ایک رسالہ شائع کرتا تھا، جسے وہ ہاتھ سے لکھتا اور پھر فوٹو اسٹیٹ کر کے دوستوں اور ادیبوں میں بانٹتا تھا۔ کتابی کیڑا تھا، اس لیے دانش سے اس کی جلد ہی گاڑھی چھننے لگی۔

ارشاد مستوئی کو شعر و ادب کا چسکا تھا۔ اس نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر پر گریسو یوتھ لٹریری سوسائٹی بنالی۔ فارسی سے علی بابا تاج، انگریزی سے عظیم انجم ہانبھی اور کچھ اس کے شعبے کے دوست مل کر ہفتہ وار ادبی سرکل کرتے۔ ندیم کو تو کوئی شوق نہ تھا، البتہ دانش شریک ہوتا۔ وہیں اس کی ملاقات صبا دشتیاری صاحب سے بھی ہوئی۔ جو اسلامیات کے پروفیسر تھے مگر زبردست قسم کے کامریڈ آدمی تھے۔ ارشاد اور اس کے دوستوں کا ان کے ہاں آنا جانا ہوتا۔ دانش اکثر ان کے ساتھ ہو لیتا۔

مستوئی کی آمد ورفت بہرحال کمرے میں کم تھی، اس لیے کمرہ عملاً دانش اور اس کے دوسرے روم میٹ ندیم کے حوالے تھا۔ دانش کی طرح ندیم بھی ایک چھوٹے سے شہر سے یونیورسٹی پڑھنے آیا تھا۔ ذہانت میں تو بس اوسط درجے کا تھا، البتہ ہنس مکھ تھا۔ دونوں کی دوستی جلد ہی ہوگئی۔

ندیم اپنے شہر میں کافی عرصہ تک صحافت کرتا رہا تھا۔ علاقائی نامہ نگاروں والے سبھی گر اور گن اس میں تھے۔ اسے لگا کہ اب چھوٹے شہر سے نکل کر صوبائی دارالحکومت میں قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ اس نے طے کیا تھا کہ صحافت کی ڈگری لے کر وہ کسی بڑے ادارے سے منسلک ہو جائے گا۔ اپنے شہر میں وہ جس مقامی اخبار کی نمائندگی کرتا تھا، کوئٹہ آ کر اسی کے ڈیسک سے وابستہ ہوگیا۔

اسی نے دانش کو صحافت کی جانب مائل کیا۔

وہ اکثر اسے چھیڑتا کہ، "میاں، فلسفہ پڑھ کر کرو گے کیا؟ فلسفے سے پیٹ نہیں بھرتا، نہ اس ملک میں کوئی کام ملتا ہے۔ میرے ساتھ چلو، کچھ صحافت سیکھ لو، کسی وزیر کے اسٹنٹ بھی لگ گئے تو قسمت سنور جائے گی۔ ویسے بھی بلوچستان میں وزیروں کو پڑھے لکھے لوگوں کی نہیں، منشیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

دانش اول تو اس کے مذاق کو ٹالتا رہا۔ پھر کچھ عرصہ وقت گزاری کے لیے اس کے ساتھ جانے لگا، اور پھر جلد ہی اسے صحافت کا چسکا لگ گیا۔ جیب خرچ الگ سے ملنے لگا۔ اسی طرح یونیورسٹی میں وہ جب بھی فارغ ہوتا، ندیم کے ساتھ ابلاغِ عامہ کی کلاس میں بیٹھ جاتا۔ وہیں سے دونوں اخبار کے دفتر چلے جاتے، جہاں سے شام گئے ان کی واپسی ہوتی۔

جلد ہی انھوں نے مستوئی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسے روزنامہ 'مشرق' کے ادبی صفحے کی ایڈیٹنگ کا کام مل گیا۔ کام اُس کے مزاج کا تھا، اس لیے اس نے فوراً حامی بھر لی کہ چلو شوق بھی پورا ہوگا اور کچھ چائے سگریٹ کا خرچ بھی نکل آئے گا۔

دانش نے لیکن شروع میں ہی یہ طے کر لیا کہ وہ ڈیسک پر بیٹھنے کی بجائے رپورٹنگ کرے گا۔ اسے لگا کہ ڈیسک پر بیٹھنے کا مطلب محض منشی بننا ہے۔ صوبہ بھر اور ملک بھر سے آنے والی خبروں کی ایڈیٹنگ کرنا اور سرخیاں بنانا، جس میں کوئی تخلیقی کام نہیں۔ جب کہ رپورٹنگ میں اسٹوری

تلاش کرنے کے لیے نہ صرف نت نئے خیالات لانے پڑتے بلکہ اسے لکھتے ہوئے اسلوب کا بھی خیال رکھنا پڑتا۔ اسٹوری یا فیچر کو چٹخارے دار بنانے کے لیے وہ مختلف کتابوں کے حوالے بھی استعمال کرتا۔ انٹرنیٹ سے بھی خوب مدد لیتا۔ اس لیے اس کے مطالعے کی دھاک اسی وقت سے بیٹھنا شروع ہوگئی تھی۔ شروع شروع میں وہ یونیورسٹی سے ہی مختلف مسائل پہ اسٹوریاں بنا کر لے جاتا۔ لیکن ان میں بھی جدت لانے کی کوشش کرتا۔ اسی بنا پر اس کی یہ اسٹوریاں خوب چلیں اور اِس طرح اُس کی رپورٹنگ بھی چل پڑی۔

یوں صحافت اسے راس آنے لگی۔ گو کہ وہ بلوچستان میں بالخصوص مقامی اخبارات میں کام کرنے والے صحافیوں کی صورتِ حال سے مطمئن نہ تھا۔ تینوں دوستوں کے درمیان اکثر اس پر بحث ہوتی۔ سات سے دس گھنٹے کام کے عوض چار سے چھ ہزار معاوضے کو وہ کھلا استحصال کہتا تھا۔ مستوئی اس سے اتفاق کرتا۔ جب کہ ندیم اسی کو دلیل بناتے ہوئے 'زرد صحافت' کی حمایت کرتا تھا۔ دانش اس کے بھی حق میں نہ تھا۔ لیکن یہ بیماری صحافت میں اس قدر سرایت کر چکی تھی کہ اب اسے جڑ سے اکھاڑنا، صحافت کی جڑیں کاٹنے کے مترادف ہوتا جا رہا تھا۔

ایک روز اس کے پاس اسٹاف رپورٹر کی ایک خبر آئی، جس پر کونے میں ایک طرف نیوز ایڈیٹر کے نام لکھا ہوا تھا، ''سر جی، خبر کو اچھی کوریج دیں، ایک بوری گندم طے ہوئی ہے۔'' اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور خبر ندیم کو بنانے کے لیے دے دی۔

اخبار میں چھٹی کا دن کم ہی میسر ہوتا ہے۔ اس لیے جس روز اخبار کی چھٹی ہوتی، وہ اسے عیاشی سے تعبیر کرتے۔ کبھی دوستوں کے ساتھ ہنہ یا پیر غائب کی سیر کو نکل جاتے، یا پھر سونے کی عیاشی کرتے۔

ایک بار ایسی ہی چھٹی کے روز دانش نے رائے دی کہ ''روز دفتر میں ہمارا دماغ اخبار مالکان کے تابع ہوتا ہے۔ کیوں نہ آج اس ذہنی وفکری آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ہمیں ذہنی وفکری طور پر غلام بنانے والے تمام اخبار مالکان سے انتقام لیتے ہوئے ان کے خلاف ہجویہ گفتگو کی جائے۔''

ہاسٹل کے کمرے میں موجود صحافت سے وابستہ چار دوستوں کے علاوہ دو مزید دوستوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ شام انھوں نے اخبار مالکان کی پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہوئے بتائی۔

معمولی تنخواہوں کے عوض ملازمین کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے والے اُن کے استحصالی رویے سے لے کر بعض اخبار مالکان کی ٹنڈ اور توند پر انھوں نے مفصل و مدلل گفتگو کی۔ ٹنڈ اور توند نکلنے کے منطقی و سائنسی جواز تلاش کرنے کے لیے ایک دوست نے اخبار مالکان کی توند، مولوی کی توند اور بنیے کی توند کا تقابلی جائزہ لیا۔ ایک اور دوست نے پروفیسر کی ٹنڈ اور ایڈیٹر کی ٹنڈ کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ بالآخر رات دیر گئے تک جاری رہنے والی یہ گفتگو بنا کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہوئی۔

اگلے روز نہ صرف وہ کلاس میں تاخیر سے پہنچے بلکہ اخبار دیر سے پہنچنے کے باعث بھی اُسی ٹنڈ والے ایڈیٹر اور بڑی توند والے اخبار مالک کے سامنے صفائیاں پیش کرتے رہے۔

یونیورسٹی کے ان ہنستے کھیلتے دنوں میں سوائے ندیم کے، دانش اور مستوئی نے صحافت کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ تب تک وہ ان کے لیے وقت گزاری اور جیب خرچ کا ایک ذریعہ تھی۔ انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ جسے وہ محض وقت گزاری سمجھ رہے تھے، وہی آگے چل کر ان کا مستقبل بننے والی ہے۔

******

فلسفے میں دانش نے حسبِ توقع فرسٹ کلاس، فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ گاؤں میں تو اس کی دھوم مچ گئی۔ لیکن وہ سب سے پہلے مٹھائی لے کر ذوق صاحب کے پاس پہنچا۔ ذوق صاحب کو نہ صرف اس کی کامیابی کا یقین تھا بلکہ وہ اس کی صحافتی سرگرمیوں سے بھی خوب آگاہ تھے۔ اس کی اسٹوریز اور فیچرز وہ دلچسپی سے پڑھتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

وہ جب اپنی کامیابی کی خوش خبری دینے کے لیے ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے اسے بٹھا کر تسلی سے اس کے مستقبل سے متعلق اپنی رائے دی۔

"دیکھو دانش، مجھے تمہاری کامیابی کا تو پہلے سے ہی علم تھا۔ لیکن تم یہ بھی جان لو کہ اس

کامیابی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اب نوکریوں کے دروازے تم پر کھل جائیں گے۔ اس ملک میں ابھی علم کی قدر نہیں۔ ہاں، صحافت کی جو راہ تم نے اختیار کی ہے، اسی کو مستقبل بنا لو تو تمہارے مالی معاملات شاید کچھ حل ہو سکیں۔ تم اچھا لکھ لیتے ہو، اور بول بھی اچھا لیتے ہو۔ یہاں کی صحافت میں اب یہی کچھ چلنے والا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے تم اب کچھ توجہ اس طرف بھی دو۔"

یوں پہلی بار اس نے صحافتی کیریئر کے متعلق سنجیدگی سے سوچا۔ اپنے استاد کا مشورہ اس نے پلو سے باندھ لیا۔ کوئٹہ واپس آ کر اس نے اخبارات کے لیے رپورٹنگ جاری رکھی۔ جلد ہی اسے لاہور سے شائع ہونے والے ایک انگریزی روزنامے کی نمائندگی مل گئی۔ اگلے دو برس وہ اسی اخبار سے وابستہ رہا۔ دو سال بعد اسے بیورو چیف بنا دیا گیا۔ چھوٹا موٹا آفس بھی اس نے بنا لیا۔ مالی معاملات بہتر ہوئے تو اس نے سریاب میں یونیورسٹی کے پاس ہی ایک کالونی میں چھوٹا سا ایک گھر کرائے پہ لے لیا اور گھر والوں کو بھی بلا لیا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سبھی گھر والے آ جاتے، باقی ایام میں بھی عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا۔ اس کے بڑے بھائی تو اب اکثر وہیں اس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

ندیم نے یونیورسٹی کے بعد پہلے ایک ملکی اخبار جوائن کیا اور صرف ایک برس بعد ہی ایک اُس وقت اس اخبار کا بیورو چیف بن گیا، جب اس کے بیورو چیف نے استعفیٰ دے دیا۔ پھر جلد ہی اسے ایک وزیر سے سفارش کروا کر ایک ٹی وی چینل کا بیورو چیف بن گیا۔ چینل اسے خوب راس آیا۔ سیاسی لوگوں سے اس کے تعلقات بھی خوب تھے۔ اگلے ایک آدھ برس میں اس نے کوئٹہ کے پوش علاقے میں اپنا گھر لے لیا۔ ایک اچھی سی گاڑی بھی اس کے پاس آ گئی۔

اُدھر اس دوران ارشاد مستوئی کا والد فوت ہو گیا۔ والد سے اس کی گہری ذہنی وابستگی تھی۔ وہ اس سے اس قدر دلبرداشتہ ہوا کہ فارمیسی کے آخری برس کا امتحان تک نہ دے سکا۔ یونیورسٹی میں اس کی ایک کلاس فیلو سحرش سے اس کی قربت کے چرچے دوستوں میں عام تھے۔ امتحان کے بعد سحرش نے اپنے ایک کزن سے منگنی کر لی۔ اس واقعہ نے بھی ارشاد کو دلبرداشتہ کر دیا۔ یوں اس کا تعلیمی سلسلہ معطل ہو کر رہ گیا۔

کچھ عرصہ بعد اس نے بھائی کا گھر بھی چھوڑ دیا۔ ان کے ایک دوست کی غیر سرکاری تنظیم کے دفتر میں کام کرنے لگا اور وہیں رہنے لگا۔ مگر دوست جانتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر منتشر تھا۔ اس لیے ندیم جلد ہی جا کر اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اور ایک نئے سرائیکی چینل میں اسے ایڈجسٹ کروا دیا۔ کچھ عرصے بعد اسے ایک سندھی اخبار کے بیورو آفس کی آفر آئی تو اس نے فوراً قبول کر لی۔

یونیورسٹی کے بعد بھی کچھ عرصہ تینوں دوست ساتھ ہی رہائش پذیر رہے۔ شہر کے وسط میں واقع کبیر بلڈنگ میں جہاں اخبار کا دفتر واقع تھا، وہیں ایک کمرہ کرائے پر لے کر وہ ایک ساتھ رہنے لگے۔ لیکن ندیم نے جب اپنا گھر لے لیا تو اس نے کمرہ چھوڑ دیا۔ اس نے دانش سے بھی بہت کہا کہ اس کے ساتھ شفٹ ہو جائے، اس نے دانش کی منتیں بھی کیں، دوستی کے واسطے بھی دیے، حتیٰ کہ اس کی ہٹ دھرمی کے باعث ناراض ہو کر چلا گیا لیکن دانش نے یہ گوارا نہ کیا۔ بعد ازاں کرائے کا گھر لے کر وہ بھی وہاں سے منتقل ہو گیا۔ ارشاد مستوئی نے اسی کمرے کو اخبار کا دفتر اور رہائش گاہ بنا لیا۔ پھر یہی ایک عرصے تک دوستوں کا ٹھکانہ رہا۔

اس زمانے میں بلوچستان کے سیاسی حالات میں تناؤ بڑھنا شروع ہوا تھا۔ ملک کے معروف ٹی وی چینلز نے اپنے دفاتر کوئٹہ میں کھولنے شروع کیے تھے۔ ندیم اپنے تعلقات کے باعث پہلے ہی چینل جوائن کر چکا تھا اس لیے اس کی خاصی پی آر بن چکی تھی۔ ڈیرہ بگٹی کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر نواب اکبر خان بگٹی پہلے پہاڑوں پر چلے گئے اور پھر وہیں ایک آپریشن میں ان کا قتل ہو گیا۔ اس قتل کے بعد بلوچستان میں آگ اور خون کی ہولی شروع ہو گئی۔ کوئٹہ مرکز ہونے کے باعث سب سے زیادہ متاثر تھا۔ ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکے روز کا معمول بن گئے۔ بلوچستان جو خبر کو ترستا تھا، خبروں کا مرکز بن گیا۔ اسی لیے تمام ملکی اداروں نے بلوچستان کا رخ کیا، جس سے صحافت کا سکوپ تو بڑھا مگر صحافیوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آنے والا برسوں میں یہ سکوپ ان کے لیے قبرستان بن جائے گا۔ نواب بگٹی کے قتل کے بعد سیاسی تنظیمیں اور طلبا تنظیمیں بھی مین اسٹریم میں آگئیں۔

یہ سیاسی ہلچل کے عروج کا دور تھا۔

پھر انھی دنوں میں دانش سے وہ اسٹوری ہوگئی، جس نے اس کی صحافتی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔

اپنی ہر دل عزیز اسٹوریوں کے باعث دانش اب نہ صرف صحافتی حلقوں میں معروف تھا بلکہ اخبار کے قارئین میں بھی مقبول تھا۔ ایک روز وہ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اس کے موبائل پر ایک فون آیا۔ دوسری طرف اس کا یونیورسٹی کے زمانے کا ایک دوست بات کر رہا تھا، جو یونیورسٹی میں ایک معروف طلبہ تنظیم کا رہنما ہوا کرتا تھا۔ اس نے دانش سے ملنے کا وقت مانگا۔ دانش نے اسے اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔

اگلے دن وہ نوجوان اس کے آفس میں موجود تھا۔

یہ نوجوان دانش کے لیے ایک معروف گوریلا رہنما کے انٹرویو کی پیش کش لے کر آیا تھا۔ ایک صحافی کے لیے یہ بڑا اسکوپ تھا۔ ایک ایسا گوریلا لیڈر، جسے عسکری ادارے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں، اس کا ایکسکلیوزو انٹرویو ہونا، یقیناً ایک بہت بڑا اسکوپ تھا۔ لیکن دانش نے کوئی عجلت نہیں دکھائی۔ اس نے نہایت ذمہ دارانہ اور پیشہ ورانہ انداز اختیار کیا اور نہایت احتیاط سے تمام معاملات واضح کیے۔

"پہلے تو یہ بتائیے کہ اتنے سینئر اور معروف صحافیوں کے ہوتے ہوئے اس انٹرویو کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں؟"

اُس کے اِس سوال پر اس کے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا، "بالکل ٹھیک۔ پہلی بات تو یہ کہ سینئر صحافیوں میں سے اکثر ہمارے لیے قابل اعتبار نہیں۔ دوم یہ کہ آپ ایک مؤقر انگریزی ادارے سے وابستہ ہیں، جس کے ذریعے اپنی آواز زیادہ دور تک پہنچائی جا سکتی ہے، اور سوم یہ کہ آپ کو مقامی قارئین میں بھی پذیرائی حاصل ہے۔"

"آپ کا شکریہ، لیکن انٹرویو کا طریقہ کیا ہوگا؟" اس نے بات آگے بڑھائی۔

"آپ کو وہاں تک لے جانا ہمارے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی خطرے کا باعث ہو سکتا ہے، اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ آپ اپنا سوال نامہ لکھ کر دے دیں، ہم جواب آپ تک پہنچا دیں گے۔"

"لیکن یہ کیسے پتہ چلے گا کہ جواب واقعی مذکورہ گوریلا کمانڈر نے خود لکھے ہیں؟"

"اچھی بات!" اس کا دوست زیرِلب مسکرایا۔ "اس کا ایک ذریعہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ابھی اُن سے فون پہ بات کرلیں، لیکن اس میں دو مسائل ہیں؛ ایک تو یہ کہ آپ پھر کہیں گے کہ یہ کیسے کنفرم ہو کہ یہ آواز انھی کی ہے، دوسرا یہ کہ آپ کے اور ہمارے بھی فون ٹیپ ہو رہے ہیں، اس لیے یہ ذریعہ بھی قابلِ عمل نہیں۔ سو، ہم ٹیکنالوجی کے سہارے سے اسے آسان بناتے ہیں۔ آپ پہلے اسکائپ پہ ان سے بات کرلیں، پھر سوال نامہ دے دیں۔"

"تو انٹرویو اسکائپ پہ کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اس لیے کہ اسے بھی ریکارڈ کیے جانے کا خدشہ موجود ہے۔"

"ہونہہ!" دانش نے ایک لمبی سانس لی۔

اُس روز اُس نے اپنے دوست سے اپنے ایڈیٹر سے بات کرنے کا کہہ کر کچھ وقت طلب کیا۔ پھر جب ایڈیٹر سے اس کی بات ہوئی تو انھوں نے اس کی خوب تعریف کی اور کہا کہ یہ ایک ایکسکلیوزِو ہوگا، جو اُس کے کیریئر کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔ اس لیے اُسے فوراً یہ انٹرویو کرنا چاہیے۔

یوں اس نے حامی بھر لی۔

اسکائپ پہ ہونے والی بات چیت کے بعد اس نے تسلی کرلی اور پھر زبردست تیاری کے بعد دس سوالوں پہ مشتمل ایک جامع سوال نامہ تیار کر کے بھیج دیا، جو تین دن بعد اسے تفصیلی جوابات کے ساتھ موصول ہوگیا۔ جسے زبردست لفاظی کے ساتھ اسٹوری بنا کر اس نے اخبار کو بھیج دیا۔

اس کی اسٹوری نے حسبِ توقع اشاعت کے ساتھ ہی تہلکہ مچا دیا۔ ارشاد مستوئی نے اس کی اجازت سے اسے ترجمہ کر کے اپنے سندھی اخبار کو بھی بھیج دیا۔

دانش کی اسٹوری ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کی شہ سرخی بن چکی تھی۔ اس کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہے تھے تو کہیں اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔

مفرور گوریلا لیڈر کا یہ پہلا ایکسکلیوزو انٹرویو تھا۔ اس لیے اس کی اشاعت پہ کھلبلی مچنا یقینی تھا۔

لیکن اب اسے اس کے نتائج بھی بھگتنا تھے۔ اسی روز آفس سے واپسی پر اسے اٹھالیا گیا۔ ایک دن پہلے جہاں اس کی خصوصی اسٹوری چھپی تھی، اگلے روز عین وہیں اس کے لاپتہ ہونے کی خبر چھپی ہوئی تھی۔

******

اگلے تین روز وہ لاپتہ رہا۔

وہ کہاں تھا، اور اسے لے جانے والے کون تھے، اسے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ اس دوران اس کی آنکھوں پر مسلسل پٹی بندھی رہی۔ اس کے ہاتھ پیچھے سے باندھ دیے گئے تھے، اور اسے ایک بنا بازو کی کرسی پر بٹھادیا گیا تھا۔

وقفے وقفے سے کچھ لوگ اس کے پاس آتے اور اس سے اُس انٹرویو کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا انداز نہایت کرخت اور غیر مہذب ہوتا۔ ان میں ایک اسے نہایت فحش گالیاں نکالتا۔ وہ بولنے کی کوشش کرتا تو گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوجاتی۔ یوں پہلے دو دن وقفے وقفے سے ہونے والی اس پریکٹس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ ان کا مقصد اسے ذہنی کوفت میں مبتلا کرنا ہے۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کا شکار ہورہا تھا۔

انھوں نے اسے جسمانی طور بھی توڑنے کی کوشش کی۔ وہ پانی مانگتا تو ٹھنڈا یخ پانی اس کے منہ پر ڈال دیا جاتا۔ سونے کی کوشش کرتا تو انتہائی تیز آوازوں کا شور شروع ہوجاتا۔ دو، دوراتیں مسلسل جاگنے کے باعث اس کی آنکھیں سوجھ کر لال ہوگئیں۔

دوسری طرف اس کے ساتھی اس کی رہائی کے لیے مسلسل احتجاج کر رہے تھے۔ کوئٹہ سمیت پورے بلوچستان میں مظاہرے شروع ہوچکے تھے۔ اسلام آباد میں بھی مظاہرہ ہوا۔ صحافیوں کی مرکزی تنظیم کی جانب سے ہونے والے احتجاج کے بعد بین الاقوامی تنظیموں نے بھی دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔

آدھر ندیم نے زمین آسمان ایک کیا ہوا تھا۔ وزیروں، مشیروں سے لے کر جان پہچان کے سبھی بیوروکریٹ اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں کی وہ منتیں سماجتیں کرتا رہا اور وضاحتیں دیتا رہا کہ

وہ ایک سادہ سا صحافی ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ ندیم کو اس لیے بھی زیادہ فکر تھی کہ کچھ عرصے سے بلوچستان میں سیاسی کارکنوں کو جس طرح لاپتہ کر کے مارنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اسی کی دیکھا دیکھی صحافیوں کا بھی اب قتل عام شروع ہو چکا تھا۔ بلوچستان بھر میں کئی صحافی اس کا نشانہ بن چکے تھے۔ اس لیے ندیم چاہتا تھا کہ ایسا کچھ ہونے سے پہلے وہ اپنے دوست کو بچا لے۔

اسی طرح ارشاد مستوئی نے صحافتی تنظیموں پر اس کی رہائی کے لیے دباؤ جاری رکھا۔ یوں ایک طرف ندیم کی نجی کوششوں اور دوسری طرف صحافتی تنظیموں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث ہی شاید دانش کو لاپتہ کرنے والوں کے لیے مشکلات اس قدر بڑھ گئیں کہ بالآخر تیسرے روز انھیں اسے رہا کرنا ہی پڑا۔

تیسرے روز اس کی آنکھوں کی پٹی اور ہاتھوں کی رسی کھول دی گئی۔ اسے نہانے دھونے کا موقع بھی دیا گیا۔ جب وہ تازہ دم ہو چکا تو ایک سفید ریش آدمی اس کے پاس آیا۔ اس نے دانش سے نہایت سلیقے سے کچھ گفت گو کی۔ وہ نہ صرف دانش کی نجی زندگی کی تمام تفصیلات سے آگاہ تھا بلکہ اس نے دانش کو وہ گفت گو بتا کر حیرت میں ڈال دیا جو اس کے انٹرویو کا ذریعہ بننے والے دوست نے اس کے ساتھ دفتر میں کی تھی۔ یہ گفت گو صرف ان دونوں کے بیچ ہوئی تھی، کوئی تیسرا شریک نہیں تھا۔ اور دانش کو اتنا بھی یقین تھا کہ ان اداروں کے کیمرے کم از کم اس کے دفتر کے کمرے میں نہیں ہو سکتے۔

''دیکھو نوجوان،'' بڑے میاں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ''ہم جانتے ہیں کہ تم ایک باصلاحیت صحافی ہو، تم میں آگے بڑھنے کی قوت ہے۔ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ تم اس قوت کو ملک کی ترقی اور مثبت کاموں میں استعمال کرو نہ کہ شر پسندوں کے لیے۔ ایک بات یاد رکھو، نظریہ پاکستان، اسلام اور پاک فوج کے ادارے کے خلاف کسی قسم کی منفی سرگرمیاں قابل معافی نہیں ہیں۔ تم کیوں کہ نوجوان ہو، اور پہلی بار کسی کے ہاتھوں لاشعوری طور پر استعمال ہو گئے ہو، اس لیے تمہاری اس غلطی سے درگزر کیا جا رہا ہے۔ یہ یاد رہے، کہ اسے پہلی اور آخری غلطی ہونا چاہیے۔''

انھوں نے اپنی بات مکمل کی اور دانش کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی پھر دو لوگ اندر آئے۔ انھوں نے اسی طرح دانش کی آنکھوں پر پٹی باندھی، البتہ اس بار اس کے ہاتھ کھلے رکھے گئے۔ جس کے بعد اسے ایک جیپ میں بٹھایا گیا اور ایک طویل ڈرائیونگ کے بعد ایک جگہ اتار کر چھوڑ دیا گیا۔

جب گاڑی چلی گئی تو دانش نے اپنی آنکھوں کی پٹی اتاری۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہزار گنجی کے ایک ویران علاقے میں موجود ہے۔ کسی طرح گرتا پڑتا وہ ہزار گنجی کے بس اڈے تک پہنچا۔ اس کی جیب میں کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے ہمت کر کے ایک لوکل بس کے ڈرائیور کو اپنی صورت حال بتائی۔ ڈرائیور اتفاق سے نیک دل ثابت ہوا۔ اس نے اُسے چائے بھی پلائی، اور اپنے ساتھ بٹھا کر بازار بھی پہنچا دیا۔

دانش وہاں سے سیدھا پریس کلب پہنچا۔

اتفاق سے اس وقت پریس کلب میں اسی کی گم شدگی کے حوالے سے اجلاس جاری تھا۔ اسے دیکھتے ہی تمام ساتھی خوشی سے کھل اٹھے اور اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ویرانے سے ہمت کر کے پریس کلب تک پہنچنے والا دانش دوستوں کے حلقے میں آتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

دوست پریشان ہو گئے۔

''جلدی سے ایمبولینس بلاؤ، دانش کمزوری کے باعث بے ہوش ہو چکا ہے۔''

کسی نے آواز لگائی۔

اگلے دو روز اُس نے ہسپتال کے بستر پر ہی گزارے۔

******

ہسپتال سے گھر منتقل ہونے کے بعد بھی کئی دنوں تک اس کی طبیعت سنبھل نہ سکی۔

دانش جسمانی طور پر تو ٹھیک ہو گیا، ذہنی اذیت سے نہ نکل سکا۔

وہ تین دن، اس کے ذہن کے گوشوں میں چپک کر رہ گئے۔

صحافی دوست اس کی عیادت کو آتے رہے۔ لیکن اس کی ذہنی حالت سے سبھی اندازہ لگا

رہے تھے کہ اب صحافت دانش کے لیے مشکل ہوگئی تھی۔ یہ بھی سننے میں آرہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت اور مسلسل غیر حاضری کے باعث اس کا اخبار اسے فارغ کرنے والا تھا۔

ایسے میں ندیم آگے آیا۔

اس نے اپنے ادارے سے بات کر کے کسی طرح ایک رپورٹر کی جگہ پیدا کر لی۔ جیسے ہی دانش کی حالت کچھ بہتر ہوئی، وہ فوراً یہ آفر لے کر اس کے پاس آگیا۔لیکن دانش سنتے ہی بھڑک اٹھا:

''تو پاگل ہوگیا ہے؟ تجھے پتہ ہے ندیم، کہ میں سست آدمی ہوں۔ یہ ٹی وی کا کام مجھ سے نہیں ہوگا۔ اخبار میں تو دن بھر کی بمشکل چار، پانچ خبریں بنتی ہیں، شام کو لکھ کر بھیجنی ہوتی ہیں، یہاں تو ہر وقت بھاگم دوڑ ہے۔ مجھ سے یہ تیزی نہیں ہوگی۔ میں وہاں بہت ریلیکس ہوں۔ اب تو مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ میں فیلڈ میں کام کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ تو یہ آفر کسی اور ضرورت مند دوست کو دے دے۔''

''دیکھ میرے فلسفی بھائی، پاگل مت بن، یہاں لوگ اس پوسٹ کے لیے سفارشیں کرواتے پھر رہے ہیں، تجھے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیوں کہ مجھے پتہ ہے کہ تجھ سے 'لفافے' والے کام ہوتے نہیں، اس لیے اخبار کی تنخواہ پہ کب تک گزارہ کرے گا۔ ابھی تو اکیلا ہے، کل بیوی بچے ہوں گے تو سر پیٹتا پھرے گا تو......''

''تو تو نے ابھی سی میری 'فیملی پلاننگ' بھی کر ڈالی۔'' دانش نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا،''دیکھ بھائی، تیری اس خصوصی مہربانی کا شکریہ۔لیکن تو جانتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے، بلکہ میری وجہ سے تو بھی ڈسٹرب ہو جائے گا۔''

''دیکھ دانش، میں نے تیری ہر ضد مانی ہے، حالاں کہ تو میرے ساتھ گھر شفٹ نہیں ہوا تو میں نے طے کیا تھا کہ آج کے بعد تجھ سے کبھی بات نہیں ہوگی، لیکن دیکھ میری جان یہ کیریئر کا معاملہ ہے، میری بات مان لے بھائی......''

وہ دانش کو سمجھاتا رہا، لیکن دانش اپنی بات پہ اڑا رہا۔ ندیم نے بھی گویا ہار نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے روز وہ ارشاد مستوئی کو ساتھ لے کر آیا۔ دونوں نے دانش کے بڑے بھائی سے علیحدگی

میں مل کر انھیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ اور ان سے یہ عہد لے کر واپس ہوا کہ وہ دانش کو ہر صورت اس کے لیے منالیں گے۔

اُس روز رات کے کھانے پہ بڑے بھائی صاحب نے اُس سے ندیم کی آفر سے متعلق تفصیل سے گفت گو کی۔ انھوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں ایسی مدلل گفت گو کی کہ دانش کو ہاں کہتے ہی بن پڑی۔

ارشاد کی معاشی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ سندھی اخبار کے بعد وہ مقامی روزنامے سے وابستہ تھا، وہ بھی بند ہوگیا۔ جس کے بعد وہ آن لائن نیوز ایجنسی میں سے بطور رپورٹر وابستہ ہوگیا تھا مگر تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ ندیم نے اپنے چینل سے بات کر کے اسے وہیں اسکرپٹ ایڈیٹر لگوا دیا اور مستوئی کو راضی کر لیا کہ وہ پارٹ ٹائم کچھ وقت یہاں دے دیا کرے، اس سے اس کی آمدن کا اچھا انتظام ہوگیا۔

یوں یونیورسٹی کے تینوں دوست، ایک عرصے بعد ایک ہی ادارے میں پھر اکٹھے ہوئے۔

ندیم گو کہ زرد صحافت کی تمام خصوصیات سے مملو تھا لیکن دانش کے معاملے میں وہ ایک زبردست نبھانے والا دوست ثابت ہوا۔ وہ دانش کا ہر طرح سے خیال رکھتا۔ حالاں کہ دفتر کی حد تک بہرحال وہ اس کا باس تھا، لیکن دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ندیم، اس کے مزاج سے آشنا تھا، اس لیے کبھی کام کے حوالے سے اس پر دباؤ نہ رکھا۔ حتیٰ کہ مرکزی آفس سے کبھی کوئی شکایت ہوتی تو بھی وہ خود ہی سنبھال لیتا۔ محض چھ ماہ میں اس نے گنجائش نکال کر دانش کو سینئر رپورٹر بنا دیا۔ جس کے بعد کام کا دباؤ اس پر مزید کم ہوگیا۔ اکثر معمول کا کام جونیئر اسٹاف ہی سنبھال لیتا۔ کبھی کوئی اہم واقعہ ہوتا دانش چلا جاتا، ورنہ وہ اپنے مزاج کا کام کرنے کو ہی ترجیح دیتا۔ ہفتے میں کوئی ایک آدھ خصوصی پیکیج بنا دیتا۔ اس کا کام مرکزی آفس کو بھی پسند تھا، اس لیے وہ بھی اس سے خوش تھے۔

******

اس دوران دانش کی طرح ارشاد مستوئی کو بھی ایک زبردست اسٹوری بطور سکوپ ملی۔

سن 2009 کے آغاز میں کوئٹہ میں موجود اقوامِ متحدہ کے اہلکار کو اغوا کر لیا گیا۔ اس اغوا کی ذمے داری ایک بلوچ مسلح تنظیم نے قبول کی۔ کچھ ہی دن بعد ارشاد کو ایک سیٹلائٹ نمبر سے کال موصول ہوئی۔ جس میں اس سے کہا گیا کہ جان سولیکی کے اغوا کی ویڈیو سی ڈی ایک لفافے میں ڈال کر کوئٹہ کے مرکزی ڈاک خانے کے پوسٹ باکس میں ڈال دی گئی ہے، وہ ابھی جا کر وہاں سے لے سکتا ہے۔

یہ ایک بڑی دھماکے دار خبر تھی۔ جان سولیکی امریکی شہری تھا۔ اس کے اغوا کی خبر انٹرنیشنل میڈیا میں ہیڈ لائن بنی ہوئی تھی۔ ارشاد نے آفس سے دو ساتھیوں کو ساتھ لیا، اور فوراً پوسٹ آفس پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ پوسٹ آفس تو بند تھا، وہاں صرف چوکیدار موجود تھا۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کی اجازت کے بغیر پوسٹ باکس کھولنے سے انکار کر دیا۔ ارشاد اور اس کے دوستوں نے اسے سارا ماجرا سنایا اور سمجھایا کہ یہ ملکی سلامتی کا معاملہ ہے۔ وہ اس کے سامنے صرف سی ڈی نکالیں گے، اگر کوئی مسئلہ ہوا تو وہ خود سنبھال لیں گے۔

خاصی تکرار کے بعد آخرکار پوسٹ باکس کا تالا توڑ کر سی ڈی برآمد کر لی گئی۔

سی ڈی لے کر وہ فوراً دفتر پہنچے اور کمپیوٹر آپریٹر سے اسے چلانے کو کہا۔ یہ سی ڈی جان سولیکی کے مختصر بیان پر مبنی تھی، جس میں وہ اپنے اغوا کا قصہ اور اغوا کاروں کے مطالبات بیان کر رہا تھا۔

ارشاد کے ہاتھ بڑی اسٹوری لگ چکی تھی۔

اس نے اسی وقت بیٹھ کر خبر بنائی اور تمام اخبارات بھجوانے کے بعد پہلی فرصت میں ندیم اور دانش کو فون کیا اور فوراً اپنے آفس آنے کو کہا۔ آفس میں اس نے دونوں کو ویڈیو دکھائی۔ دونوں حیرت سے اچھل پڑے اور اس سے سی ڈی مستعار دینے کی درخواست کی۔ ارشاد نے سی ڈی اس شرط پر ان کے حوالے کی کہ صبح اخبارات میں اس کی خبر آنے کے بعد کل وہ کسی بھی وقت یہ ویڈیو ریلیز کر سکتے ہیں۔

اُدھر اگلے دن پتہ چلا کہ غفلت برتنے پر مذکورہ ملازم کو معطل کر دیا گیا۔ بلوچستان کے

معروف فکشن رائٹر آغا گل اُن دنوں پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ ارشاد نے ان سے ذاتی طور پر بات کی اور انھیں سارا معاملہ بتا کر بے چارے چوکیدار کی ملازمت بچالی۔

خبر شائع ہوتے ہی ملکی میڈیا سمیت عالمی میڈیا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ارشاد یک دم ایک گم نام رپورٹر سے معروف صحافی بن گیا۔ ملک کے نام ور صحافی اور بین الاقوامی رپورٹرز بھی اس سے رابطہ کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جان سولیکی کے اغوا کاروں نے بھی براہِ راست اپنی خبریں ارشاد کو بھجوانا شروع کر دیں۔

یہ ارشاد کا مسلح تنظیموں کے گروہ سے پہلا رابطہ تھا۔ اس کے بعد یہ رابطہ اس کے لیے خبروں کا مستقل ذریعہ بن گیا۔

******

اگلے ہی سال مگر ارشاد ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہوا۔

اُن دنوں این ایف سی ایوارڈ کی تقریب گوادر میں رکھی گئی تھی۔ کوئٹہ سے صحافیوں کا ایک وفد براستہ روڈ گوادر جانا تھا۔ سینئر صحافیوں کے اس وفد میں ارشاد مستوئی بھی شامل تھا۔ گوادر میں انھیں جس ہوٹل میں رہائش دی گئی، وہاں سیف بلوچ اور خالق رند اس کے ساتھ تھے۔ پہلے دن کی کوریج کے بعد شام کو وہ کمرے میں بیٹھے خبر بنا رہے تھے کہ اس دوران ارشاد نے سگریٹ کا ٹوٹا پھینکنے کو جونھی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا، پاس سے گزرتی بجلی کی گیارہ ہزار والٹ کی ٹرانسمیشن لائن نے اسے پکڑ لیا۔ سیف بلوچ اور خالق رند جب تک پکڑ کر اسے الگ کرتے، اس کا بازو اور چہرہ بری طرح جھلس چکے تھے۔

گوادر سے اسے فوراً کراچی پہنچایا گیا۔ جہاں وہ ایک مہینہ ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اس کا چہرہ اور بازو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گئے مگر ڈاکٹر باوجود کوشش کے اس کا ہاتھ نہ بچا پائے۔ یوں اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

دانش اور ندیم کے لیے یہ روح فرسا واقعہ تھا۔ اپنے دوست کو اس تکلیف میں دیکھنا دانش کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پہلی بار جب وہ اسے ہسپتال ملنے گیا، تو غش کھا کر گر پڑا۔ ندیم اور

دوسرے دوستوں نے مل کر اسے سہارا دیا۔ارشاد کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔

ارشاد پے در پے حادثات کا شکار ہوتا رہا۔ایک برس قبل ہی اس کا بڑا بھائی گردوں کی بیماری کا شکار ہو کر بے وقت چل بسا تھا۔ہاتھ گنوانے کے صرف دو سال بعد اس کا دوسرا بھائی کینسر کے ہاتھوں جوانی میں چل بسا۔ جھلسنے کا واقعہ جب پیش آیا تو اس کی شادی کو بھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔مگر ارشاد نے ہمت نہ ہاری۔وہ بائیں ہاتھ سے لکھتا اور اسی ایک ہاتھ سے جلد کمپیوٹر پہ کمپوزنگ کرنے لگا۔نیوز ایجنسی میں اس کے بیورو چیف عرفان سعید نے ٹی وی چینل جوائن کیا تو اسے اپنی جگہ بیورو چیف لگوا دیا۔بلوچستان میں اخبارات نیوز ایجنسی کے سہارے ہی چلتے ہیں۔اس لیے خصوصاً سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ تعلقات بہتر رکھتی ہیں۔نیوز ایجنسی کا بیورو چیف بننے کے بعد ارشاد مستوئی کے بھی ان سے مراسم اور تعلقات وسیع پیمانے پر استوار ہوئے۔

******

2010 کے بعد بلوچستان میں صحافیوں کا قتل عام شروع ہو چکا تھا۔

فوجی آمریت کے خاتمے اور بظاہر جمہوری حکومتوں کے قیام کے باوجود بلوچستان کے لیے کچھ نہیں بدلا تھا۔بلکہ جاری انسرجنسی میں مزید تیزی آ گئی تھی۔سرکار اور سرمچاروں کے مابین جاری جنگ میں صحافی سینڈوچ کی طرح پس رہے تھے۔دوسری طرف اسپاٹ رپورٹنگ میں کئی صحافی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔بلوچستان کا کوئی کونا صحافیوں کے لیے محفوظ نہ رہا۔کوئٹہ کے بعد خضدار صحافیوں کا قبرستان بن گیا۔نوبت یہاں تک آ گئی کہ کئی ماہ پریس کلب کو تالے پڑے رہے۔

یہ سارے واقعات دانش کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنتے۔جب بھی کوئی صحافی دوست متاثر ہوتا، دانش کئی دنوں تک اس واقعے کے حصار میں رہتا۔وہ اکثر صحافیوں کی تنظیم کی جانب سے ہونے والے احتجاج اور پریس کلب کے تعزیتی اجلاس میں بھی شریک نہ ہوتا۔دوستوں کو اس کے مزاج کا پتہ تھا، اس لیے وہ شکایت بھی نہ کرتے۔البتہ اس کے مخالفین اس موقع کا فائدہ اٹھاتے اور خوب زہر افشانی کرتے۔اس پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا کہ وہ خفیہ اداروں کے پے رول پر ہے، کیوں کہ خفیہ ادارے جب کسی کو اٹھا کر لے جائیں تو بنا کام لیے کسی کو ایسے زندہ نہیں چھوڑتے۔

اس دوران بی بی سی اردو کے نمائندہ ایوب ترین کو بلوچ گوریلا لیڈر کا انٹرویو کرنے کے بعد جب خفیہ اداروں کی جانب سے دھمکایا گیا تو دانش کو اپنے تین دن یاد آگئے، اور کئی دن تک وہ ان تین دنوں کی بازگشت میں رہا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اسی ایوب ترین کو اسی گوریلا لیڈر کی مسلح تنظیم کی جانب سے ان کی مناسب کوریج نہ کرنے کے الزام میں دھمکایا گیا تو دانش پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"گویا صحافی اب نوٹس بورڈ بن کر رہ گیا ہے، جس کا جو جی چاہے اس پر چسپاں کر کے چلا جائے، خبر چھاپو تو سرکار مارے گی، نہ چھاپو تو سرمچار مارے گا۔ صحافت نہ ہوئی، پل صراط کا سفر ہوا کہ جس میں موت حتمی ہے گویا!"

وہ اکیلا ہی چیختا رہ جاتا بس!

2010 میں جب سماء ٹی وی کا نوجوان کیمرہ مین اعجاز رئیسانی یوم القدس کی ریلی میں میزان چوک پر ہونے والے بم دھماکے کی کوریج کے دوران شہید ہو گیا تو دانش کئی دنوں تک سکتے کے عالم میں رہا۔ اس واقعہ میں ارشاد کے سر پر بھی کافی چوٹیں آئی تھی۔ اعجاز کی وفات کے ایک ماہ بعد اس کے ہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی تو اس کے گھر والوں نے اس کا نام سماء رکھ دیا۔ چینل نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور دیگر چینلز کے لیے یہ کوئی اہم خبر نہ تھی۔ دانش نے اس پر ایک بھرپور اسٹوری لکھ ڈالی اور اخبار میں چھاپ دی۔ صحافتی حلقوں میں کئی دنوں تک اس اسٹوری کا چرچا رہا۔

لیکن اسے اس بات کا قلق تھا کہ ایک ایک کر کے صحافی دوست مارے جا رہے تھے اور صحافتی تنظیمیں اور ادارے عملی طور پر ان کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔

"صرف ایک تعزیتی ریفرنس سے دوستوں کا قرض تو ادا نہیں ہو جاتا ناں۔ یہ تو سیاست دان بھی کرتے ہیں، اسمبلی میں بیٹھ کر ایک تعزیتی قرارداد پاس کر لی اور اللہ اللہ خیر صلا!" اعجاز کی موت پر سکتے کی کیفیت سے نکلنے کے بعد وہ پریس کلب کے کینٹین میں دوستوں کے درمیان اپنی روایتی خوش گپیوں کے ساتھ شکایت کر رہا تھا۔

"لیکن صحافتی تنظیمیں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہیں بھلا؟" ارشاد مستوئی نے اعتراضی نقطہ اٹھایا۔

''یار کچھ تو ہمارے دوستوں کو بھی خیال کرنا چاہیے۔بھلا عین دھماکے کی جگہ پہ کھڑے ہو کر کوریج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔تم نے اعجاز کی تصویر دیکھی ہے زخمی حالت میں؟ وہ ایف سی چوکی کے اندر کھڑے ہو کر کوریج کر رہا ہے۔جب کہ یہ کیمرہ ان مناظر کو دور سے بھی زوم کر سکتا ہے۔تو پھر عین دھماکے کی جگہ جا کر خود کو کیوں خطرے میں ڈالا جائے؟!''

سماء ہی کے رپورٹر سیف بلوچ کی دلیل واقعی ٹھیک تھی۔باقی دوستوں نے بھی اس کی حمایت کی۔البتہ یہ طے ہوا کہ پریس کلب اور صحافیوں کی تنظیم مل کر رپورٹرز کی تربیت کا اہتمام کریں۔نیز شہید ہونے والے دوستوں کی مالی معاونت کے لیے حکومت سے بھی ٹھوس بنیادوں پر بات کی جائے۔اس حوالے سے ڈاکیومنٹ کی تیاری کا فریضہ ارشاد کے ذمے لگایا گیا۔

''پریس کلب کی کینٹین کی چائے نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے اوئے فلسفی، چل میں عباسی ہوٹل سے تجھے کولڈ ڈرنک پلا کے تیرا دماغ ٹھنڈا کرتا ہوں۔آجا۔''

سیف اس کے ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا اسے باہر لے آیا۔سماء کا کیمرہ مین عمران شیخ بھی ان کے ہم راہ تھا۔یاروں کی یہ ٹولی اکثر ساتھ ہی دیکھی جاتی تھی۔

صحافتی حلقوں میں ندیم اور مستوئی کے علاوہ دانش کے قریبی دوست بہت کم تھے۔ان میں سے ایک سیف بھی تھا۔لیاری، کراچی کا یہ بلوچ نوجوان ہم فکر ہونے کے باعث جلد ہی ان کے جگری دوستوں میں شامل ہو گیا۔ اکثر اس سے ملنے سماء کے آفس آتے جاتے اس کی یاری عمران شیخ سے بھی ہو گئی۔ یہ ان چند صحافیوں میں سے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ انسان، خبر سے زیادہ اہم ہے۔اس لیے ہمیں نیوز بریک کرنے سے زیادہ توجہ انسان پر دینی چاہیے۔جس پر اکثر سینئر صحافی طنزاً انھیں ''جذباتی صحافی''، بھی کہتے تھے۔ایک تربیتی ورکشاپ میں اسی بات پر ٹرینر سے ان کا مباحثہ ہو گیا۔

اسلام آباد سے آئے ہوئے ٹرینر کا یہ کہنا تھا کہ اچھے صحافی کے لیے جذبات سے مبرا ہونا ضروری ہے۔ورنہ وہ اچھا جذباتی انسان تو ہو سکتا ہے، اچھا صحافی نہیں، جیسے ایک ڈاکٹر اگر جذباتی بن جائے تو وہ کسی کا آپریشن نہیں کر سکتا، اسی طرح اگر صحافی جذباتی بن جائے تو وہ خبر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔اس پر عمران شیخ نے سوال کیا کہ جناب، میرے گھر میں آگ لگی ہے اور وہ جل رہا ہے، اب

مجھے پہلے اپنے چینل کے لیے اس کی فوٹیج بنانا چاہیے یا آگ بجھانے کی کوشش کرنا چاہیے؟ ٹرینر صاحب کا فوری جواب تھا کہ "بطور صحافی پہلے فوٹیج دینا آپ کا فرض ہے، باقی سب اس کے بعد آتا ہے۔"

بس اسی پر اچھا خاصا مذاکرہ ہوگیا۔ سیف اور دانش نے عمران کی حمایت کی۔ جب کہ سینئر انھیں طنزیہ مسکرا کر دیکھتے رہے۔

لیکن کوئٹہ کے ایک دھماکے میں جب عمران شیخ نے کوریج کے دوران کیمرہ چھوڑ کر زخمیوں کو اٹھا کر ایمبولنس میں ڈالنا شروع کیا اور بعد ازاں اس کی یہ فوٹیج کسی ٹی وی چینل پر آگئی، تو وہ سینئر بھی اس جذبے کو سراہے بغیر نہ رہ سکے جو اس خیال کے حامی نہ تھے۔

******

اس دوران ارشاد مستوئی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے دانش کو مزید مضمحل کر دیا۔

اُن دنوں این ایف سی ایوارڈ کی تقریب گوادر میں رکھی گئی تھی۔ کوئٹہ سے صحافیوں کا ایک وفد براستہ روڈ گوادر جانا تھا۔ سینئر صحافیوں کے اس وفد میں ارشاد مستوئی بھی شامل تھا۔ گوادر میں انھیں جس ہوٹل میں رہائش دی گئی، وہاں سیف بلوچ اور خالق رند اس کے ساتھ تھے۔ پہلے دن کی کوریج کے بعد شام کو وہ کمرے میں بیٹھے خبر بنا رہے تھے کہ اس دوران ارشاد نے سگریٹ کا ٹوٹا پھینکنے کو جونھی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا، پاس سے گزرتی بجلی کی گیارہ ہزار والٹ کی ٹرانسمیشن لائن نے اسے پکڑ لیا۔ سیف بلوچ اور خالق رند جب تک پکڑ کر اسے الگ کرتے، اس کا بازو اور چہرہ بری طرح جھلس چکے تھے۔

گوادر سے اسے فوراً کراچی پہنچایا گیا۔ جہاں وہ ایک مہینہ ہسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ اس کا چہرہ اور بازو رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گئے مگر ڈاکٹر باوجود کوشش کے اس کا ہاتھ نہ بچا پائے۔ یوں اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

دانش اور ندیم کے لیے یہ روح فرسا واقعہ تھا۔ اپنے دوست کو اس تکلیف میں دیکھنا دانش کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پہلی بار جب وہ اسے ہسپتال ملنے گیا، تو غش کھا کر گر پڑا۔ ندیم اور

دوسرے دوستوں نے مل کر اسے سہارا دیا۔ارشاد کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔

ارشاد پے در پے حادثات کا شکار ہوتا رہا۔ایک برس قبل ہی اس کا بڑا بھائی گردوں کی بیماری کا شکار ہو کر بے وقت چل بسا تھا۔ہاتھ گنوانے کے صرف دو سال بعد اس کا دوسرا بھائی کینسر کے ہاتھوں جوانی میں چل بسا۔ جھلسنے کا واقعہ جب پیش آیا تو اس کی شادی کو بھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔مگر ارشاد نے ہمت نہ ہاری۔وہ بائیں ہاتھ سے لکھتا اور اسی ایک ہاتھ سے جلد کمپیوٹر پہ کمپوزنگ کرنے لگا۔نیوز ایجنسی میں اس کے بیورو چیف عرفان سعید نے ٹی وی چینل جوائن کیا تو اسے اپنی جگہ بیورو چیف لگوا دیا۔بلوچستان میں اخبارات نیوز ایجنسی کے سہارے ہی چلتے ہیں۔اس لیے خصوصاً سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ تعلقات بہتر رکھتی ہیں۔نیوز ایجنسی کا بیورو چیف بننے کے بعد ارشاد مستوئی کے بھی مراسم اور تعلقات وسیع پیمانے پر استوار ہوئے۔

******

10 جنوری 2013 کی شام، یاروں کی اس ٹولی کو پریس کلب سے ایک ساتھ نکلے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ میزان چوک پر دھماکے کی خبر آ گئی۔

نیوز چینلز پہ ٹکر آتے ہی، کوئٹہ میں واقع نجی چینلز کے دفاتر سے ڈی ایس این جی کی دوڑیں لگ گئیں۔سبھی جو جائے وقوعہ پر پہنچنے کی جلدی تھی، اور پہلے پہنچنے کی جلدی تھی۔ایف سی کی چوکی پر حملہ ہوا تھا اور بہت بڑا دھماکہ تھا۔اس لیے ندیم نے دانش سے کہا کہ وہ خود جائے وقوعہ پر پہنچے۔دانش ڈی ایس این جی لیے دوڑا۔وہ جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو سیف اس سے پہلے اپنی ٹیم کے ساتھ موجود تھا۔

اسے دیکھ کر سیف نے چھیڑ خانی کرتے ہوئے کہا،" تو لیٹ ہے فلسفی! ہماری فوٹیج آن ایئر جا چکی۔"

دانش نے مسکراتے ہوئے کہا،" زوئے، اتنی جلدی بھی مت کر کہ تیری فوٹیج نہ آ جائے کہیں کسی دن۔"

سیف مسکرایا اور یہ کہہ کر چل دیا،" چل مست، کام کر!"

دانش نے کیمرہ مین سے کہہ دیا کہ وہ دور سے ہی زوم کر لے اور جائے وقوعہ کی فوٹیج لے

لے۔اتنے میں ہیڈ آفس سے فون آ گیا اور دانش نے لائیو اپ ڈیٹس دینا شروع کر دیں۔

حسبِ معمول کچھ ہی دیر میں معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔چینلز پہ معمول کے پروگرام آنا شروع ہو گئے۔لیکن ساتھ ہی ہر چینل نے اپنے نمائندوں کو مزید تفصیلات جمع کرنے کا کہہ دیا کیوں کہ نو بجے کے مرکزی خبرنامے میں یہ واقعہ شہ سرخی ہو گا اور اسی سے متعلق زیادہ بات ہو گی۔

دانش نے گاڑی آفس دوڑائی تاکہ دفتر میں بیٹھ کر اب کچھ مختصر دورانیے کے پیکجز بنائے جائیں اور کچھ Exclusive Stories کی جائیں۔

اگلے دو گھنٹے اسی میں گزر گئے۔دانش نے کچھ پرانی تفصیلات جمع کیں کہ اب تک میزان چوک پر کتنے دھماکے ہوئے ہیں؟ان میں کتنی اموات ہوئی ہیں؟نیز کچھ سیاسی لوگوں اور متعلقہ حکام سے حالیہ دھماکوں کے اثرات اور مضمرات کے حوالے سے بات چیت کی۔کچھ اپ ڈیٹس ارشاد سے بھی لے لیں اور ایک مکمل پیکیج بنالیا۔

اس کی یہ اسٹوریز واقعی Exclusive ثابت ہوئیں جو دیگر چینلز پہ نہیں تھیں۔9 بجے کے مرکزی خبرنامے میں جب یہ اسٹوریز چل رہی تھیں اور وہ آفس میں بیٹھا چائے پی رہا تھا تو اسے سیف کا فون آیا۔

"ہاں بول جانی!"اسے اندازہ تھا کہ سیف نے کس لیے فون کیا ہے۔

"زوئے بازی مار لی تو نے۔"سیف نے اس کا پیکیج دیکھ کر ہی فون کیا تھا۔

"مانتا ہے کہ نہیں جانی!"وہ مسکرایا۔"تبھی تو تجھے کہتا ہوں کہ صرف بریکنگ نیوز سے کام نہیں بنتا بھائی،نام کے لیے کچھ اور کام بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"ہاں یار فلسفی، تیرا اسٹائل واقعی ہٹ کے ہے۔"سیف نے اسے سراہا۔"چل یہ بتا،اب چائے پلا رہا ہے کہ نہیں؟"

"میں تو چائے ہی پی رہا ہوں......میرے آفس آجا،تیرے لیے بھی بنوا لیتا ہوں۔"

"ابھی نہیں یار۔آفس سے کسی بھی وقت فون آسکتا ہے،اپ ڈیٹس کے لیے۔خبرنامہ ختم ہو تو میں آتا ہوں۔"

''چل ٹھیک ہے۔میں انتظار کرتا ہوں۔عمران فارغ ہو تو اسے بھی لیتے آنا۔پھر چل کر مستوئی کا سر کھاتے ہیں۔''

''ہاہاہا۔۔۔او،کے جانی۔''

فون رکھ کر وہ کمپیوٹر آپریٹر کے ساتھ بیٹھ گیا کہ کچھ اور فوٹیجز نکال کر مزید کوئی ایک آدھ پیکیج بنا لے۔

وہ ابھی اس پر کام کر ہی رہا تھا کہ جمال اپنے کمرے سے اسے پکارتا ہوا تیزی سے نکلا۔

''خیر تو ہے؟ کیا ہوا ندیم؟''اس نے ندیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھیں۔

''یار علمدار روڈ پہ دھماکہ ہو گیا ہے، جلدی ڈی ایس این جی نکالو۔''

''ایک اور دھماکہ......اوہ مائی گاڈ!''اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں یار، بہت بڑا دھماکہ ہے، بڑی تعداد میں Casualties کی اطلاع ہے۔تم آفس سنبھالو، میں نکل رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر ندیم تیزی سے باہر نکل گیا۔

******

وہ وہیں کرسی میں دھنسا رہ گیا!

اسے اندازہ ہو گیا کہ آج کوئٹہ میں خیر نہیں۔حکومت کے خلاف اسلام آباد کی جانب طاہر القادری کا ملین مارچ شروع ہونے سے چوبیس گھنٹے پہلے کوئٹہ میں تسلسل سے ہونے والے بم دھماکے کسی بڑے انسانی سانحہ کا پیش خیمہ ہو سکتے تھے۔اس نے کمپیوٹر آپریٹر سے کہا کہ وہ اپنا کام کرے، فی الحال وہ خود ذہنی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہیں۔

وہ اٹھ کر ڈیسک پر آ بیٹھا اور ٹی وی پہ نظریں جمالیں۔

اب تک اکثر چینلز پہ صرف ٹکر چل رہا تھا۔چینل بدلتے بدلتے وہ سماء پہ آیا تو اچانک اس کا ہاتھ حرکت کرنا بھول گیا۔

سماء پہ بریکنگ نیوز چل رہی تھی؛

علمدار روڈ پہ ایک اور دھماکہ سنا گیا، کوریج کے لیے

جانے والی سماء کی ٹیم شدید متاثر

اُس نے ایک دم فون اٹھایا اور سیف کا نمبر ملایا۔فون مسلسل بج رہا ہے، مگر کوئی اٹھا نہیں رہا۔اس نے عمران کا نمبر ملایا۔وہی ریسپانس!

اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔اس نے تیزی سے چینل بدلنے شروع کیے اور ساتھ ہی گھبرا کر ندیم کا نمبر ملایا۔اُس نے فوراً اٹھالیا۔

''ندیم، کہاں پہنچے ہو؟ کیا صورتِ حال ہے؟''

''یار دانش، میں ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ہمارے پہنچنے سے کچھ سیکنڈ پہلے دوسرا دھماکہ ہوا ہے۔ہم خیریت سے ہیں، لیکن یہاں بہت بھگدڑ ہے۔میں پھر فون کرتا ہوں۔''

''سیف کا کچھ پتہ ہے؟''

''نہیں یار، وہ لوگ ہم سے پہلے پہنچے تھے۔فی الحال کچھ نہیں پتہ۔میں دیکھتا ہوں، تم رکھو فی الحال، ہیڈ آفس سے فون آرہا ہے۔''

ندیم کی آواز میں شامل گھبراہٹ اور پس منظر سے آنے والی چیخ و پکار نے اسے ہزار ہا وسوسوں میں ڈال دیا۔اس نے ایک بار پھر سیف کا نمبر ملایا۔اب کے نمبر بند ملا۔

اس کی پریشانی دو چند ہوگئی۔اُس نے پریشانی میں مستوئی کو فون ملایا۔

اُس نے صرف یہ کہہ کر فون رکھا دیا کہ، جیو دیکھو۔

جیو پہ ٹکر آرہا تھا......

نجی ٹی چینل کے کیمرہ مین کی ہلاکت کی اطلاع

اُس نے گھبرا کر سماء لگایا۔سماء پہ چلنے والی بریکنگ نیوز نے اسے 'بریک' کر کے رکھ دیا؛

کوئٹہ کے علمدار روڈ پہ ہونے والے دوسرے دھماکے

میں سماء ٹی وی کے کیمرہ مین عمران شیخ شہید ہو گئے

جبکہ رپورٹر سیف الرحمان بلوچ لاپتہ ہیں

نیوز کاسٹر کی آواز اسے کسی کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ٹیلی ویژن سیٹ پہ دھند چھا گئی۔دھند اس کی آنکھوں تک اتر آئی تو اس نے گھبرا کر چشمہ اتار کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

ایک دم اسے احساس ہوا کہ اس کی پلکیں نم ہو چکی ہیں!

کچھ لمحے وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے اسی طرح گم صم بیٹھا رہا، جیسے کہ اس کے حواس معطل ہو چکے ہوں۔

پھر ایک دم آنکھیں پونچھیں، چشمہ پہنا اور تیزی سے آفس سے نکل آیا۔اسی تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا پارکنگ لاؤنج میں آیا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نکل پڑا۔

اس کا رخ علمدار روڈ کی طرف تھا۔

******

شدید سردی اور یخ بستہ ہواؤں کی پرواہ کیے بغیر وہ طوفانی تیزی سے بائیک دوڑاتا ہوا جائے وقوعہ پر پہنچا۔

قیامت کا منظر تھا!

ہر طرف پھٹی ہوئی لاشیں تھیں۔انسانی اعضا دور دور تک بکھرے پڑے تھے۔کوئی جسم سلامت نہ تھا۔آہ وفغاں تھی۔شدید افراتفری کا عالم تھا۔

بائیک کو تقریباً ایک طرف پھینکتے ہوئے، اس نے فوراً اسماء کی ڈی ایس این جی کی طرف دوڑ لگا دی۔باہر ساتھیوں کا رش تھا۔اندر اسماء ٹی وی کا ڈی ایس این جی آپریٹر جمیل زخمی حالت میں تھا۔

"جمیل، سیف کہاں ہے؟" اس نے جمیل کا حال پوچھنے کی بجائے آتے ہی اس سے سیف کا پوچھا۔

"پتہ نہیں یار، عمران اور سیف جیسے ہی باہر نکلے دوسرا دھماکہ ہوگیا۔عمران یہاں پاس ہی تھا، اس کی لاش ہمیں مل گئی۔سیف اب تک غائب ہے۔اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

اتنے میں باقی صحافی دوست آگے بڑھے اور جمیل کو طبی امداد دینے کی کوشش کی۔

دانش، پاگلوں کی طرح سیف کو ڈھونڈ تا رہا۔

آنسو اب اس کے رخساروں پہ تھے۔ وہ کئی سال سے فیلڈ میں تھا۔ اسے صورت حال کا بہ خوبی اندازہ تھا۔لیکن دل ہی دل میں وہ خود کو تسلیاں دیے جا رہا تھا۔

''یہیں کہیں ہوگا...... کچھ دور نکل گیا ہوگا......شاید دوستوں کی مدد کر رہا ہو...... بریکنگ نیوز کی جلدی جو رہتی تھی کھینے کو......''

ایک دم اسے اپنا ہی جملہ یاد آیا جو ابھی شام اس نے میزان چوک کے دھماکے پہ اس نے سیف سے کہا تھا......

''اتنی جلدی بھی مت کر زدے،کہیں تیری فوٹیج نہ چل جائے کسی دن!''

اس نے خود کو کوسنا شروع کر دیا۔

''بدزبان کہیں کا۔ یار کے لیے ایسی گندی بات زبان پہ لایا کیوں۔کالی زبان ہے تیری دانش۔دوست کو بھی ایسا کہتا ہے کوئی!''

وہ سوچ بھی رہا تھا، رو بھی رہا تھا اور ہر لاش کے بیچ اپنے دوست کو ڈھونڈ بھی رہا تھا۔

اچانک اس کا فون بجا......

''یار دانش، سیف کا پتہ چلا کہ زخمی ہے،کسی نے اسے ایمبولینس میں ڈال کر سی ایم ایچ بھیجا ہے۔تم وہاں پہنچو۔'' دوسری طرف ندیم تھا۔

اسے لگا کہ جیسے اسے بہت بڑی خوش خبری مل گئی ہو۔

''زخمی ہی تو ہے......ٹھیک ہو جائے گا......بچ سکتا ہے......''

اس نے فوراً موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگائی۔

******

دانش بھاگم بھاگ سی ایم ایچ پہنچا۔

یہاں لائی جانے والی لاشوں اور زخمیوں کے باعث شدید ادھم مچا ہوا تھا۔افراتفری کا عالم تھا۔ورثا اپنے لوگوں کی لاشیں شناخت کرتے پھر رہے تھے۔سبھی صحافی دوست ایک دوسرے سے

سیف کا ہی پوچھ رہے تھے۔لیکن کسی کے علم میں نہ تھا کہ سیف ہے کہاں؟ اسے کون لایا؟ کس نے اسے اٹھایا؟ کس نے شناخت کیا؟ کس نے ایمبولینس میں ڈالا؟

فوجی ہسپتال ہونے کے باوجود اس وقت سی ایم ایچ سرکاری ہسپتال کا منظر پیش کر رہا تھا۔وہاں تعینات اہلکار لوگوں کو ڈسپلن میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔پر کاہے کا ڈسپلن...... یہاں تو موت کا عالم تھا۔لوگ اپنے پیاروں کی مردہ شکل دیکھنے کو بھی اُتاولے ہوئے جا رہے تھے۔ لاشیں تھیں کہ پہچاننے میں نہ آتی تھیں۔بدن کا کوئی حصہ سلامت ہو بھی تو پہچانا جائے۔تعفن سے سر پھٹے جاتے تھے۔خون ہی خون تھا جا بجا!

دانش، وہیں بھگدڑ میں یہاں وہاں دوڑتا رہا۔ادارے کی جانب سے کئی بار فون آنے کے باوجود اس نے فون نہ اٹھایا......اس میں بات کرنے کی ہمت ہی کہاں تھی۔صرف ایک بار اس نے ندیم کا فون سنا اور اس سے کہہ دیا کہ ادارے سے خود بات کرے یا کسی جونیئر رپورٹر کو ہسپتال بھیج دے، وہ اس وقت کچھ رپورٹ نہیں کر سکتا۔ندیم نے کچھ نہ کہا، سوائے اس کے کہ وہ اپنا خیال رکھے۔

پر اُسے اپنا خیال تھا ہی کہاں......!! اسے تو کچھ بھی خیال نہ رہا تھا۔بس ایک ہی خیال تھا، ایک ہی سوال تھا......سیف کہاں ہے؟!

دو گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے۔وہ تھک ہار کر ہسپتال کے لان میں ایک بینچ پہ جا کے ڈھیر ہو گیا۔اس کا ذہن ماؤف تھا۔ہر طرف تاریکی نظر آتی تھی۔اس نے چشمہ اتار کر صاف کیا۔اور پھر اپنا سر بینچ سے لگا کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

سیف کی ہنسی اور اس کا چلبلا پن اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچانے لگا۔

''میں اچھے اور برے صحافی پہ یقین نہیں رکھتا، میرا خیال ہے کہ صحافی یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔برا صحافی، صحافی کیسے ہو سکتا ہے؟......کیوں فلسفی، تو کیا کہتا ہے؟'' سیف نے پلیٹ سے پیٹیز لیتے ہوئے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

اس روز پریس کلب کے کینٹین میں دوستوں کے ساتھ حسبِ معمول گپ شپ ہو رہی تھی۔

''میرے خیال میں آج کل صحافیوں کی اور بھی کئی قسمیں ہوگئی ہیں......'' دانش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُس روز وہ بھی شرارت کے موڈ میں تھا۔

''مثلاً؟'' ارشاد مستوئی نے لقمہ دیا۔

''مثلاً گوریلے صحافی...... یہ صحافی کم اور گوریلے زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کو ویسے تو پہاڑوں پہ ہونا چاہیے لیکن کیوں کہ وہاں جا نہیں سکتے، اس لیے انھوں نے پریس کلب کو مورچہ بنالیا ہے۔ ان کا بس چلے تو قلم کو بندوق، مائیک کو کلاشنکوف اور کیمروں کو توپ بناڈالیں......''

اس پہ زور کا قہقہہ پڑا۔

''اور کوئی قسم؟'' ایک اور دوست نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

''ہاں، ان کے مقابلے میں پھر ایک اور ہیں جاسوس صحافی، یہ صحافی کم اور سرکار کے جاسوس زیادہ ہیں۔ تنخواہ صحافتی اداروں سے لیتے ہیں لیکن کام سرکار کے خفیہ اداروں کے لیے کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اتفاق سے انھیں وہاں سے کوئی 'اسائنمنٹ' مل جائے تو یہ خود کو جیمز بانڈ سمجھنے لگتے ہیں۔ اپنے پریس کلب میں ایسے کئی صحافی پائے جاتے ہیں۔ ان کی علامات میں ایک اہم نشانی یہ ہے کہ ان کی ناک بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ کتوں کی طرح خبر کی بو کہیں بھی سونگھ لیتے ہیں۔ خواہ خبر کے لبادے میں وہ پروپیگنڈہ ہی کیوں نہ ہو۔''

''بھئی پیٹیز کی بڑی خوشبو آرہی ہے، لگتا ہے کوئی پارٹی شارٹی چل رہی ہے۔'' دانش کی بات مکمل ہوتے ہی ڈار صاحب اپنی بڑی سی توند لیے کینٹین میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔

ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی کینٹین میں نہ رکنے والے قہقہوں کا طوفان شروع ہوگیا۔ ڈار صاحب پہلے تو ہچکچائے، خود کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور پھر برا سا منہ بنا کر کہنے لگے،'' اوئے لونڈوں، تم لوگوں کو کیا میرا ل............ نظر آرہا ہے، جو یوں ہنس رہے ہو؟''

''کیوں ڈار صاحب، آپ نے کیا اس میں پھول لٹکا رکھے ہیں جو اسے دیکھ کر ہنسی آئے گی......'' مستوئی کی اس پھبتی پہ کینٹین کا کمرہ پھر قہقہوں میں ڈوب گیا۔ ڈار صاحب گالیاں دیتے اور بڑبڑاتے ہوئے اسی طرح واپس ہوگئے۔

"لیکن بھئی، اب صحافیوں کی ایک اور قسم بھی پیدا ہو گئی ہے......" اب سیف نے ہنستے ہوئے کہا اور مستوئی کو آنکھ مارتے ہوئے بات جاری رکھی: "یہ ہیں فلسفی صحافی...... ان کی نشانی یہ ہے کہ یہ حرامی فلسفہ پڑھ کر صحافت میں آتے ہیں اور پھر اپنا غلط سلط فلسفہ بے چارے کم پڑھے لکھے صحافیوں پر جھاڑ کر خود کو عالم و فاضل کہلواتے ہیں..........."

اب قہقہوں کا وہ طوفان اُبلا کہ وہ اپنی بات مکمل ہی نہ کر سکا!

"سیف شہید ہو گیا یار......سیف ہم سے بچھڑ گیا...... وہ ہمیں چھوڑ گیا......"

اچانک اس کے کانوں میں پڑنے والی ایک دل دہلا دینے والی جانی پہچانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ہسپتال کے برآمدے میں موجود سیف کے عزیز اور روزنامہ آزادی کے ایڈیٹر آصف بلوچ اور دیگر دوست گریہ وزاری کر رہے تھے۔

وہ بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا۔

"دانش، تمہارا یار چلا گیا........... وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔" ایک ساتھی روتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔

دانش نے جیسے نہ کچھ دیکھا ہو نہ سنا ہو۔ وہ وارڈ کی طرف دوڑا...... اور اس بیڈ تک پہنچا، جہاں ساتھیوں نے ایک خستہ لاش کی سیف کے طور پر تصدیق کی تھی۔

بستر پہ آدھا دھڑ موجود تھا۔ نچلا دھڑ غائب تھا۔ کئی اعضا کٹے پھٹے تھے۔ سر پھٹ چکا تھا۔ کچھ سلامت نہ تھا۔ وہ تو اپنے یار کو آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتا تھا۔ مگر اس عالم میں......

"سیف..........." اس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"دانش کو سنبھالو...... ارے دانش، کیا ہوا یار؟!"

اس کے کانوں نے یہ آخری جملہ سنا...... اور پھر اس کے حواس معطل ہو گئے۔

******

لگ بھگ چوبیس گھنٹے کی طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آیا تو گھر میں اپنے بستر پہ تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ اسے سبھی واقعات یاد آنے لگے۔ میزان چوک کا دھماکہ...... سیف سے چھیڑ چھاڑ...... پھر رات میں اس کا فون...... علمدار روڈ پہ دھماکہ............ اور پھر............ سیف کا چہرہ یاد آتے ہی اسے رونا آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

گھر والوں کی تسلیوں کے بعد مشکل سے ہوش میں آیا تو ٹی وی پہ آ بیٹھا اور سماء لگا دیا۔ وہ خود کو کوس رہا تھا کہ بے ہوشی کے باعث وہ دوست کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔

سماء کے خبر نامے میں بتایا گیا کہ سیف کی لاش کراچی کے مواچھ گوٹھ میں واقع اس کے آبائی گھر لے جائی گئی اور وہیں دفنائی گئی۔ سیف کے تین بیٹے تھے۔

سماء کا رپورٹر جب اُن سے والد کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اس کے سات، آٹھ سالہ منجھلے بیٹے نے فخر سے کہا، ”میرا باپ بہت اچھا صحافی تھا، میں بھی بڑا ہو کر اس کی طرح صحافی بنوں گا۔“

دانش کی پلکیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ بہت مشکل سے اس نے خود پہ ضبط کیا۔

اگلے روز ندیم اور مستوئی کچھ دوستوں کے ساتھ اس کی مزاج پرسی کو آئے۔ وہ کمرے میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طرح دانش صدمے کی کیفیت سے نکل آئے۔ لیکن وہ گم صم ہی رہا۔ سامنے ٹی وی بھی چل رہا تھا اور چائے کا دور بھی جاری تھا۔

”وہ دیکھو...... دیکھو شعلے نکل رہے ہیں...... وہ دیکھو آگ لگی ہوئی ہے...... اسے بند کرو...... بند کرو اسے...... جل جائے گا سب کچھ...... بند کرو............“ دانش نے اچانک چیخنا شروع کر دیا۔ اس کا اشارہ سامنے رکھے ٹی وی سیٹ کی طرف تھا۔

ٹی وی پر کوئی بریکنگ نیوز آ رہی تھی۔

دوست جب تک اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، اس کی چیخ و پکار میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دوست نے آگے بڑھ کر فوراً ٹی وی بند کر دیا۔ لیکن دانش کی چیخ و پکار بند نہ ہوئی۔ اس کے بڑے بھائی پریشانی کے عالم میں کمرے میں آئے۔ وہ اس کے دوستوں کے ساتھ مل کر اسے سکون میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔

اس کی چیخ و پکار، رونے میں بدل گئی۔

اسی طرح روتے، روتے اور سسکیاں لیتے وہ بے ہوش ہوگیا۔

******

اپنے تجربے اور صلاحیت کی بنیاد پر ارشاد مستوئی اسی سال بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کا مرکزی جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ جس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ متحرک ہوگیا۔ اس نے پہلی بار بلوچستان کے شہید صحافیوں کی فہرست مرتب کرنا شروع کی۔ 2013 کے اواخر تک یہ تعداد چالیس تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد یہی فہرست ہر جگہ بطور حوالہ استعمال ہوتی رہی۔

اگلے سال ارشاد کو رات دیر گئے دفتر سے واپسی پر جناح روڈ پر نیشنل بینک کے مرکزی آفس کے سامنے سیاہ شیشوں والی ایک لینڈ کروز میں اٹھا لیا گیا۔ یہ لگ بھگ رات ایک سے ڈیڑھ کے درمیان کا وقت تھا۔

اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی پوش علاقے میں لے جایا گیا۔ کسی ایجنسی ٹائپ دفتر میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس کی تواضع کی گئی۔ جہاں سول لباس میں ملبوس دو لوگوں نے اسے مختلف مسلح تنظیموں سے روابط پر تنبیہ کی اور ان کی خبریں چھاپنے سے منع کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ اگر خبر چھاپنی بھی ہے تو مسلح تنظیموں کا نام نہ چھاپا جائے، انھیں کالعدم لکھا جائے۔ بالآخر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد اسے واپس اسی جگہ اس تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا گیا کہ اگر احتیاط نہیں کی تو نتائج کے ذمے دار خود ہوگے۔

اگلا سارا دن تذبذب میں رہنے کے بعد بالآخر اس نے دانش اور ندیم کو رات دیر گئے دفتر بلا لیا اور ساری کتھا سنا ڈالی۔

"تم نے ان سے کیا کہا پھر؟" دانش نے پوچھا۔

"میں نے یہی کہا کہ خبریں چھاپتے ہیں تو آپ اٹھا لیتے ہیں، عدالت چھ مہینے جیل میں ڈالنے کا حکم دیتی ہے، نہیں چھاپتے تو وہ گولی مار دیتے ہیں۔ ہم اٹھایا جانا اور چھ ماہ قید برداشت کر سکتے ہیں، ایک خبر کے لیے گولی برداشت نہیں کر سکتے۔"

''یار مستوئی تم بھی احتیاط کرو خدا کے لیے۔''ندیم نے ارشاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،''رات بھر تمہاری سرمچاروں سے گپ شپ چل رہی ہوتی ہے۔ یار ہم صحافی ہیں، ہمارا کام خبر سے ہونا چاہیے۔ ہم فریق نہیں بن سکتے۔ تم جس پوزیشن پر ہو، تم پر سب کی نظر ہو گی۔''

''مستوئی ٹھیک کہتا ہے یار، ہم خبر کے لیے گولی کیوں سہیں؟ یہ خود تو پروٹوکول کے بغیر نکل نہیں سکتے، اور ہمیں انھی رستوں پر چلنا ہوتا ہے۔ جتنی چاہے احتیاط کر لیں، ہر فریق کا سب سے آسان ہدف ہم ہی ہیں۔'' دانش بگڑ ہی گیا۔

''چل اب فلسفی کو چائے پلا، اس کا موڈ برابر ہو۔''ندیم نے ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو باہر چلتے ہیں۔ چائے پی کر تم لوگ مجھے گھر پہنچا دینا۔''مستوئی نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہارا اب اکیلے گھر جانا ویسے بھی ٹھیک نہیں۔'' دانش یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے بعد ان کا معمول رہا کہ ندیم اور دانش اکثر رات دیر گئے اس کے دفتر سے جان محمد روڈ پر واقع اس کی رہائش گاہ تک پیدل اسے ساتھ چھوڑ آتے۔ اس کے بعد ندیم اپنی گاڑی میں دانش کو سریاب روڈ پہنچا کر گھر روانہ ہوتا۔ کبھی کبھار وہ نہ آپاتے تو ارشاد کسی اور ساتھی کو ساتھ لے کر چلا جاتا۔

******

28اگست 2016 کی شام اسمبلی اجلاس کی کوریج کے لیے ندیم کو بھیج کر دانش اپنے آفس میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف ندیم تھا۔

''یار مستوئی کے آفس پر حملے کی اطلاع ہے، تم فوراً پہنچو، میں دوستوں کے ساتھ اسمبلی سے سیدھا ہسپتال آ رہا ہوں، وہیں ملتے ہیں۔''

دانش گنگ رہ گیا۔

اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

اس نے فون جیب میں ڈالا اور بائیک نکال کر کبیر بلڈنگ کی طرف دوڑ پڑا۔

سول ہسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ ایدھی ایمبولینس دھاڑتی چنگھاڑتی اسی طرف روانہ ہیں۔

بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کر کے وہ سیدھا کبیر بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع ارشاد کے آفس کی طرف لپکا۔ یہاں ایک ہجوم جمع ہو چکا ہے۔ وہ لوگوں کو راستے سے ہٹاتا 'بھاگتا دوڑتا سیڑھیاں پھلانگتا سیدھا ارشاد کے کمرے کی طرف آیا۔ وہاں دفتر کا چپراسی اور کمپیوٹر آپریٹر دروازے پر موجود تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جونہی دروازے پر پہنچا، ایک لمحے کو وہیں ساکت ہو گیا۔

ارشاد اپنی کرسی پر بے جان پڑا ہوا تھا۔ گولیاں اس کی گردن اور چہرے پر لگی تھیں۔ دائیں جانب اس کا آفس اکاؤنٹنٹ محمد یونس صوفے پر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ ساتھ والے اسٹور روم کے دروازے پر نوجوان رپورٹر عبدالرسول ڈھیر ہو چکا تھا۔

دانش جیسے ایک دم ہوش میں آیا۔ وہ سیدھا ارشاد کی طرف لپکا۔ اس کا خون آلو دسر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''متوئی۔۔۔۔ یار متوئی۔۔۔'' وہ گلوگیر آواز میں ایسے پکار رہا تھا جیسے ارشاد ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ اسے پکارتے پکارتے دانش کی آنکھوں میں جھڑی لگ گئی۔ آنسو زاروقطار اس کی آنکھوں سے بہے جاتے تھے۔

اتنی دیر میں ایدھی اہلکار آ پہنچے۔ انھوں نے زخمیوں کو اسٹریچر پر ڈالنا شروع کیا۔ دانش، ارشاد کے اسٹریچر کے ساتھ چمٹ گیا۔ وہ اسی طرح روتا، آنسو پونچھتا نیچے اترا اور ارشاد کے اسٹریچر کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

ایمبولینس سائرن بجاتی پلک جھپکتے میں سول ہسپتال کے احاطے میں پہنچی۔ کئی سینئر صحافی پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے اسٹریچر کو اور دانش کو سہارا دے کر اتارا۔ دانش میں مزید ہمت نہ تھی، وہ روتا بلکتا وہیں ایمرجنسی وارڈ کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ دوست اسے سہارا دیتے رہے۔ اسٹریچر اندر لے جائے گئے۔

چند ہی لمحوں بعد بتایا گیا کہ کوئی بھی زخمی نہیں بچ سکا، تینوں ساتھی موقع پر شہید ہو چکے تھے۔

دانش ایک چیخ مار کر پاس بیٹھے ندیم سے لپٹ گیا۔مضبوط اعصاب کا مالک ندیم بھی ضبط نہ کرسکا اور اسے سہارا دیتے دیتے خود بلک بلک کر رو پڑا۔سول ہسپتال کے احاطے میں موجود ہر آنکھ اشکبار ہو چکی تھی۔

******

ارشاد مستوئی صحافتی تنظیم کا جنرل سیکریٹری تھا، اب سینئر صحافیوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔اس کے لیے ملک بھر میں احتجاج ہوا۔بلوچستان میں کئی دنوں تک مظاہرے ہوتے رہے۔ اس کے ادبی پس منظر کے باوصف شاعروں، ادیبوں نے بھی اس کے لیے دکھ کا اظہار کیا۔تعزیتی ریفرنس ہوئے۔عالمی صحافتی اداروں نے بھی واقعہ کا نوٹس لیا۔

دانش، سیف اور پھر مستوئی کی بہیمانہ موت کے بعد بکھر سا گیا۔مستوئی کے ساتھ اس کا یارانہ تھا۔آخری برس میں تو ان کی ملاقاتیں روزانہ کی بنیاد پر ہونے لگی تھیں۔وہ جانتا تھا کہ ارشاد خود ذہنی طور پر منتشر تھا۔صحافی دوستوں کی مسلسل اموات اور نجی معاشی مسائل نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ایک ماہ قبل ہی اس نے دانش سے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ چھٹی لے کر گاؤں یا کراچی جا کر رہنا چاہتا ہے۔کراچی میں شاید کسی اچھے نفسیاتی معالج کو دکھا سکے۔وہ خود کو نفسیاتی طور پر بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

ارشاد کے چالیسویں پر پریس کلب میں خصوصی تقریب رکھی گئی تھی۔وہاں سے ہو کر وہ ندیم کے ساتھ ارشاد کے آفس چلا آیا۔ارشاد کا کمرہ اب تک اسی طرح تھا۔آفس کا کام تو چل رہا تھا مگر اس کے کمرے میں آمدورفت نہیں تھی۔اس کے کسی سامان کو اب تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

دانش نے ارشاد کی ٹیبل کا دراز کھولا تو یہ کئی کاغذات سے اٹا پڑا تھا۔ارشاد کی عادت تھی، وہ مختلف نوٹس وغیرہ کاغذوں پر لکھ کر انھیں دراز میں ڈال دیا کرتا تھا۔اس کا دراز اکثر اسی طرح بھرا رہتا تھا۔دانش نے سارے کاغذ نکال کر ٹیبل پر رکھے۔اکثر کاغذوں پہ خبروں کے اہم نوٹس وغیرہ لکھے تھے۔لیکن انھی میں سب سے نیچے کاغذوں کا ایک اچھا خاصا بنڈل تھا، جس پہ ارشاد کی شاعری درج تھی۔

دانش نے ان کاغذوں کو الگ کیا اور ایک ایک کر کے پڑھنے لگا۔ ارشاد یونیورسٹی کے زمانے سے شعر کہتا تھا۔ وہ اکثر آزاد اور نثری نظمیں لکھتا تھا۔ مگر دوست جانتے تھے کہ صحافت کی طرف آنے کے بعد اس کی ادبی سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ مگر دانش یہ دیکھ کر حیران ہوتا رہا کہ ارشاد نہ صرف مسلسل نظمیں لکھ رہا تھا بلکہ یہ بلوچستان کے معروضی حالات پہ مشتمل شاعری تھی۔ ارشاد کی عادت تھی وہ ہر نظم کے آخر میں اپنے مخصوص انداز میں نام لکھ کر تاریخ اور وقت بھی لکھ دیتا تھا۔ اس کی آخری نظم وفات سے صرف ایک دن پہلے کی تھی، یہ رات کے ڈھائی بجے دفتر میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔ اس کی آخری سطریں پڑھتے ہوئے دانش کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ نظم نہ تھی، ارشاد کا اپنے قتل کا اعلان نامہ تھا؛

''رپورٹیں آنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا!''

خوش رنگ
خوابوں کی
پرچھائیوں کو
قتل کر کے
اپنے تعاقب میں
دوڑتی موت کو
شکست دے سکتا ہوں
مگر
کیا کروں کہ
میرے دیس کی محرومیوں کے ازالے
اور ظلمت کی تاریکی کو ختم کرنے
خوش حالی کا سورج

اپنے ہاتھ میں اٹھانے کی دعوے دار
دوطرفہ نادیدہ ونامعلوم قوتیں
میری دشمن بن گئی ہیں

بارود کے ڈھیر پہ ٹکی
میری آنکھوں میں قید
زندگی کا عکس
اڑنے کو پر تول رہا ہے
اور موت
رقص کرتی ہوئی
میرے جسم کے
سناٹوں میں اتر رہی ہے!!

******

ارشاد مستوئی کی وفات کے کچھ ہی ماہ بعد اچانک ایک دن یہ اعلان ہوا کہ اس کے مبینہ قاتل پکڑ لیے گئے ہیں اور ان کا اعترافی بیان بھی ریکارڈ کر لیا گیا ہے۔ صحافیوں کو صوبائی وزیر داخلہ کے آفس میں جمع ہونے کو کہا گیا۔

دانش بھی اپنی ٹیم کے ہمراہ پہنچا۔ وہاں دو نوجوانوں کو پیش کیا گیا جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ان کا اعترافی بیان اسکرین پر دکھایا گیا جس میں ان کا کہنا تھا کہ ان کا تعلق بلوچ لبریشن آرمی سے ہے اور انھوں نے حیر بیار مری کے کہنے پر ارشاد کا قتل کیا۔

یہ پریس بریفنگ صرف اسی بیان پر مبنی تھی۔ صحافیوں کو مزید سوال جواب کی اجازت نہیں دی گئی۔ ملزمان کو ایف سی کی حراست میں دے دیا گیا۔

ارشاد مستوئی کے اہلِ خانہ اور صحافیوں نے اس بیان پر شکوک کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ انھیں مذکورہ ملزمان تک رسائی دی جائے۔

حکومت نے انھیں یقین دلایا کہ آپ ایک وفد بنالیں، جلد آپ کی ملاقات ملزمان سے کروادی جائے گی۔

ابھی یہ باتیں چل رہی تھیں کہ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کہ ایف سی نے اپنی تحویل میں موجود دو ملزمان کی نشان دہی پر مستونگ کے قریب کالعدم تنظیم کے خلاف ایک کارروائی کی، جس میں سامنے سے ہونے والی فائرنگ میں مذکورہ دونوں ملزمان اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

یہ دونوں ملزمان وہی تھے، جنھوں نے ارشاد مستوئی کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔

یوں یہ فائل ہمیشہ کے لیے سرد خانے کے حوالے ہوگئی۔

******

صحافیوں کی تنظیم نے ارشاد مستوئی اور اس کے ساتھیوں کی شہادت کے دن یعنی اٹھائیس اگست کو اس کی پہلی برسی کے موقع پر یوم شہدائے صحافت قرار دے کر اسے ہر سال وسیع پیمانے پر منانے کا اعلان کیا۔ مگر اگلی برسی آنے سے ٹھیک بیس دن پہلے کوئٹہ پھر سلگ اٹھا۔

یہ 8 اگست 2016 کا دن تھا۔ صبح سویرے صحافیوں کو اطلاع ملی کہ کوئٹہ کے ایک معروف وکیل کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ لاش سول ہسپتال لائی گئی ہے۔ صحافی ہسپتال پہنچے تو وکلا کا جم غفیر پہلے سے موجود تھا۔ کچھ ہی دیر میں مزید وکیل جمع ہو گئے۔ جس میں سینئر وکلا اور ان کے رہنما بھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ سول ہسپتال کے احاطے میں کھڑے احتجاجی حکمت عملی پر غور کر رہے تھے اور رپورٹرز ان کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک دھماکہ ہوگیا۔

ہر طرف بارود پھیل گیا۔

آگ ہی آگ تھی۔۔۔۔ خون ہی خون تھا۔

پلک جھپکتے میں بلوچستان کے وکلا کی ایک نسل اس آگ میں راکھ ہوگئی۔

میڈیا کے نمائندوں کی پھر سے دوڑیں لگ گئیں۔ کیوں کہ صبح سویرے کا وقت تھا، اس لیے بہت کم رپورٹرز جمع ہو پائے تھے۔ فوری کوریج کے لیے اکثر کیمرہ مینوں کو ہی بھجوادیا گیا تھا۔

دانش اکثر صبح دیر سے اٹھنے کا عادی تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ اٹھا تو موبائل فون پر درجنوں مسڈ کالز دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ جھٹ سے ندیم کو فون ملایا، تو وہ جھلایا ہوا تھا، صرف اتنا کہہ کر فون بند کر دیا کہ ٹی وی دیکھو اور فوراً آفس پہنچو۔

دانش نے ٹی وی لگایا تو ایک وحشت ناک حیرت اس کی منتظر تھی۔

اسکرین پر ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

سب کچھ جل کر راکھ ہو رہا تھا۔

ستر سے زائد وکلا شہید ہو چکے تھے، اور مزید ہلاکتوں کا خدشہ تھا۔

آج ٹی وی کا کیمرہ مین شہزاد خان، اور ڈان ٹی وی کا محمود ہمدرد بھی شہید ہونے والوں میں شامل تھے۔ دونوں نہایت ہنس مکھ ساتھی تھے۔ وہ دانش کے سامنے ہی فیلڈ میں آئے تھے۔ کیا زندہ دل نوجوان تھے!

دونوں کا مسکراتا چہرہ یاد کر کے دانش جیسے سکتے میں آگیا۔

اُس میں ہمت نہیں تھی کہ بستر سے اٹھے اور آفس جانے کو تیار ہو۔

جانے کتنی دیر گزر گئی۔ ندیم کا پھر سے فون دیکھ کر وہ حواس باختہ اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔ اس نے جونہی شاور لگایا اسے لگا کہ شاور سے پانی کی جگہ خون برس رہا ہے اور اس کا سارا جسم لہو سے بھر گیا ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے سیف کا دو حصوں میں بٹا بدن گھوم گیا، اسے ارشاد کا گولیوں سے چھلنی چہرہ یاد آیا۔۔۔ اور ایک دم اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

دانش چکرا کر وہیں گر پڑا۔

******

واش روم میں گرنے سے دانش کو سخت چوٹیں آئیں۔

ڈاکٹرز نے ایک ہفتے کے لیے بستر پہ آرام کا مشورہ دیا۔

دانش ذہنی طور پر بکھر چکا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ بے معنی ہو چکا تھا۔

دوست اُس کی ذہنی حالت پہ شدید پریشان تھے۔

پریس کلب میں کئی دن اس کا تذکرہ رہا۔

ایک ماہ یونہی گزر گیا تو ندیم کو پریشانی لاحق ہونے لگی تھی۔

ہیڈ آفس سے بھی اب اس کی غیر حاضری کا پوچھا جا رہا تھا۔

دو روز بعد ندیم نے اسے فون کیا۔اس کی صحت کا پوچھا۔اور شام کو اسے اس خیال سے لینے آگیا کہ باہر نکلو گے، دوستوں سے ملو گے تو کچھ دل بہل جائے گا۔

شام کے وقت یہ کچھ دوست کبیر بلڈنگ کے پچھواڑے میں واقع سید ہوٹل پہ جمع ہوئے۔نہ چاہتے ہوئے بھی شہید دوستوں کا تذکرہ چل پڑا۔

”مستوئی تو ہمارا استاد تھا یار، اس نے ہمیں بہت کچھ سکھایا۔مگر خود خبر یا رپورٹ کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتا تھا، اپنی مرضی چلاتا تھا۔“ ارشاد مستوئی ایک اور قریبی ساتھی عبداللہ نے اداس لہجے میں کہا۔

”بس یار، یہ بریکنگ نیوز ہی اصل میں ہم سب کی قاتل ہے۔اسی کے چکر میں اکثر دوستوں کو جان سے جانا پڑا۔“ ایک اور دوست نے دُہائی دی۔

”بالکل، ہمیں اس کلچر کے خلاف ایک ہونا پڑے گا۔“ ندیم نے اس کی حمایت کی۔

”بھائی، جب واقعہ ہوجائے تو پھر ہم سب بریکنگ نیوز کے چکر میں ہوتے ہیں۔سارے اصول اور قاعدے اس وقت بھول جاتے ہیں۔ہیڈ آفس سے الگ سے دباؤ ہوتا ہے۔نوکری بھی تو کرنی ہے نا آخر!“ عبداللہ نے ایک تلخ حقیقت کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا۔

”نوکری کی تے نخرہ کی۔“ ندیم نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کش لگاتے ہوئے کہا۔ باقی دوستوں نے بھی اس کی تائید کی۔ندیم نے سگریٹ، ایش ٹرے میں بجھایا اور لمبا سا ہونہہ کھینچا۔ دانش اتنی دیر میں اٹھ کر چل دیا تو ندیم نے آواز دی، ”تو کہاں چلا اب؟“

”آتا ہوں۔“ دانش نے جیسے بے خیالی میں جواب دیا اور دبے قدموں چلتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔

مگر کافی دیر گزر گئی تو ندیم کو کچھ پریشانی ہوئی۔

''یہ کہاں چلا گیا پھر؟'' ندیم نے پریشانی سے کہا اور یہاں وہاں دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ ہوسکتا ہے کوئی فون کرنے یا سننے کے لیے باہر نکلا ہو۔ لیکن دور تک اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

''کہیں کتابیں دیکھنے تو نہیں چلا گیا فلسفی؟'' عبداللہ نے لقمہ دیا۔

ساتھ ہی واقع کتابوں کی مشہور دکان سیلز اینڈ سروسز دانش کا مشہور ٹھکانہ تھی۔ پریس کلب کے علاوہ وہ اکثر یہیں پایا جاتا۔ اس کے مالک منصور بخاری خود علم شناس آدمی ہیں، اس لیے وہ ایسے نوجوانوں کی خاص قدر کرتے ہیں۔ دانش جب بھی آتا، فوراً چائے آجاتی اور بخاری صاحب اس سے بحث بھی کرتے اور اس سے چھیڑ خانی بھی کرتے رہتے۔

''میں دیکھ کر آتا ہوں ذرا۔'' ندیم یہ کہہ کر اٹھا اور تیز تیز قدم چلتا، فرلانگ بھر فاصلے پہ موجود سیدھا بخاری صاحب کی دکان پہنچا۔

دکان پہ بخاری صاحب خود موجود تھے۔ لیکن دانش کا اتا پتا نہ تھا۔ بخاری صاحب سے پوچھنے پر الٹا انھوں نے شکایت کی کہ بھئی جہاں ملے، پکڑ کے لے آؤ، اس سے کہو نئی کتابیں اور گرم چائے اس کی منتظر ہے۔

ندیم نے اس کا نمبر ملایا تو گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہ اٹھایا۔ ''لگتا ہے فلسفی پہ پھر موڈ طاری ہوگیا ہے!'' یہ کہہ کر وہ واپس آ کر دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں بیٹھ گیا۔ وہ کئی برس سے دانش کے اس موڈ کا عادی تھا۔ اس لیے بے فکر ہو کر دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں محو ہوگیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد، وہ چائے پی رہے تھے کہ ندیم کے موبائل پہ ایک فون آیا، جس نے اس کے چہرے کا رنگ اڑا دیا۔

''خیر تو ہے انسپکٹر صاحب؟'' اس نے فون پہ کہا۔

پولیس کا سن کر سب دوستوں کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوگئے۔

آگے سے کوئی جواب پا کر ندیم نے کہا، ''اچھا ٹھیک ہے آپ ایس ایچ او صاحب سے کہیں کہ اسے اپنے پاس بٹھائیں، میں ابھی پہنچتا ہوں۔''

"خیر تو ہے؟" اس کے فون رکھتے ہی عبداللہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں یار اپنے فلسفی نے کیا کر دیا ہے...... سریاب تھانے سے فون تھا کہ آ کر اپنے بندے کو لے جاؤ ورنہ ہم لاک اپ میں ڈال دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا اور اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"ہمیں اپ ڈیٹ کرنا یار۔" ساتھ بیٹھے دو دوستوں میں سے ایک نے کہا۔

"وہاں پہنچ کر بتاتے ہیں، آؤ یار۔" ندیم یہ کہہ کر چل پڑا۔

عبداللہ اس کے ساتھ ہی نکلا۔

******

وہ دونوں تھانے پہنچے تو دانش کے چلانے کی آواز انھیں مرکزی گیٹ سے ہی سنائی دی۔

"میں آپ کو پاگل لگتا ہوں؟...... میں ایک ذمہ دار صحافی ہوں...... آپ میری ایف آئی آر لکھیں، ورنہ آپ کو پتہ ہے کہ میں کہاں تک جا سکتا ہوں۔"

دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ دانش ان کے سامنے کرسی پہ بیٹھا چلا رہا ہے۔ ایس ایچ او اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دانش کے دونوں طرف سپاہی یوں مستعد کھڑے ہیں، گویا ابھی اسے پکڑ لیں گے۔

"او آؤ یار ندیم، یہ کیا چیز پال رکھی ہے۔ تمھارے چینل کا نام لیا اس لیے میں نے تمھیں فون کر لیا، سنبھال بھئی اپنی چیز۔" ایس ایچ او نے انھیں اندر آتے دیکھ کر بے زاری سے کہا، جیسے وہ انھی کے انتظار میں بیٹھا ہو۔

"کیا چیز، کیا مطلب؟...... میں آپ کو چیز لگتا ہوں؟...... میں کوئی احمق ہوں؟...... گدھا ہوں؟...... فٹ پاتھیا ہوں......؟ کوئی اٹھائی گیرہ ہوں؟......" دانش کھڑا ہو گیا اور چلا اٹھا۔

"او نہیں سر جی، آپ تو بہت شریف آدمی ہیں، میں تو............"

"کیا ہوا دانش؟ کیا بات ہے؟" ندیم نے ایس ایچ او کی بات کاٹتے ہوئے دانش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''یار ندیم..........اچھا ہوا تم آ گئے..........انھیں سمجھاؤ یار..........میں اتنی دیر سے انھیں کہہ رہا ہوں کہ ہمارے دوستوں کا قتل ہوا ہے..........بریکنگ نیوز ان کی قاتل ہے..........وہ جائے وقوعہ پر موجود تھی..........اسی کا پیچھا کرتے ہوئے ہمارے دوست مارے گئے..........اس نے ہمارے دوستوں کے چیتھڑے اڑا دیے..........یہ ہمارے کئی دوستوں کی قاتل ہے.......... ہم اس کے عینی شاہد ہیں..........یہ آج بھی ہر طرف دندناتی پھر رہی ہے..........میں کہہ رہا ہوں، اس کے خلاف ایف آئی آر کاٹو..........اسے فوری گرفتار کرو اور جیل میں ڈالو..........ورنہ یہ اسی طرح خون بہاتی رہے گی..........لیکن یہ ایس ایچ او صاحب میری بات ہی نہیں سن رہے..........یہ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل ہو گیا ہوں......''

اس کی آواز رندھ گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم ہی کہو ندیم..........کیا میں پاگل ہوں؟..........تم کتنے سالوں سے مجھے جانتے ہو..........تم بتاؤ، کیا میں نے کبھی پاگلوں جیسی کوئی حرکت کی ہے؟..........کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟..........کیا اس نے ہمارے دوستوں کو نہیں مارا؟..........کیا ہمارے دوست اسی کے پیچھے نہیں گئے تھے..........؟ تم نے خود دیکھا کہ سیف کی کیا حالت ہوئی تھی؟..........مستوئی کو اس نے کس بے دردی سے مارا..........سول ہسپتال میں اس نے ہمارے دوستوں کے چیتھڑے اڑا دیے..........سب نے دیکھا..........جب اتنے گواہ موجود ہیں تو یہ اس خونی قاتل کے خلاف ایف آئی آر کیوں نہیں کاٹتے؟..........یہ اسے جیل میں کیوں نہیں ڈالتے..........؟ اس کی نقل و حرکت پہ پابندی کیوں نہیں لگاتے؟..........یہ کیوں ہم سب کو اس کے ہاتھوں مروانا چاہتے ہیں؟..........کیوں ندیم؟..........آخر کیوں؟''

وہ پھٹ پڑا اور ندیم کے گلے لگ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

عبداللہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

لیکن ندیم کو دانش کی اس کیفیت کا اندازہ تھا۔

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایس ایچ او اور عبداللہ کو تسلی دی۔

اور پھر دانش کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا، ''نہیں دانش، کس نے کہا تم غلط ہو۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ایس ایچ او صاحب بالکل ایف آئی آر کاٹیں گے۔''

پھر اس نے دانش کو خود سے الگ کیا اور ایس ایچ او سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، ''سر آپ ایف آئی آر کاٹیں، باقی تفصیلات ہم آپ سے کل آ کر لیں گے۔''

''جو حکم جناب!'' ایس ایچ او ندیم کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔

''چلو اب گھر چلتے ہیں، کل پھر مزید بات کریں گے۔'' ندیم نے دانش کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن یار..........'' دانش نے جیسے غنودگی کے عالم میں کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن چھوڑ جانی، ایس ایچ او صاحب نے کہہ دیا نا کہ ایف آئی آر ہو جائے گی۔ چل اب ضدمت کر۔'' عبداللہ نے اس کی بات روک دی۔

اور پھر دونوں اسے ندیم کی گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر لے آئے۔

******

اُسے اُس کے کمرے تک پہنچا کر انھوں نے دانش کے بڑے بھائی سے کہا کہ آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ بھائی صاحب نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور چائے کے انتظام کا کہہ کر واپس آئے تو دیکھا کہ ندیم اور عبداللہ پریشان اور حواس باختہ سے بیٹھے ہیں۔

بھائی صاحب کے استفسار پہ جب انھوں نے بولنا شروع کیا تو اس کے چہرے پر بھی وہی پریشانی اور حواس باختگی عیاں ہونے لگی۔

ان کی بات مکمل ہوئی تو کچھ لمحے توقف کے بعد بھائی صاحب نے پریشانی کے عالم میں ان سے پوچھا، ''آپ اُس کے دوست ہیں، ہم تو ٹھہرے سیدھے سادھے دیہاتی لوگ۔ کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ آپ لوگ ہی مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیے؟''

ندیم اور شاہد نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا، جیسے کہ کچھ کہنے کے لیے ایک دوسرے سے اجازت طلب کر رہے ہوں۔

پھر وہ کافی دیر بولتے رہے۔ حتیٰ کہ چائے ٹھنڈی ہوگئی۔

بالآخر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ، "ہم اپنے دوست کو گنوانا نہیں چاہتے۔ لیکن فی الحال شاید اس کے لیے اِس سے بہتر کوئی صورت نہیں......"

بھائی صاحب نے گہری سوچ میں غرق، یوں سر ہلاتے ہوئے انھیں رخصت کیا گویا ان کی بات سے اتفاق کر رہے ہوں۔

******

کچھ روز بعد اسی نیوز چینل پہ، جہاں دانش کام کرتا تھا، بریکنگ نیوز چل رہی تھی:

اپنے صحافی دوستوں کی موت کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے ہمارے سینئر رپورٹر دانش اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے، ان کے علاج کے پیشِ نظر انھیں ذہنی مریضوں کے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے

جس وقت یہ خبر اپنے آفس میں سنتے ہوئے ندیم کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں، عین اسی وقت نفسیاتی ہسپتال کے وارڈ میں ٹیلی ویژن پہ یہی خبر سنتے ہوئے دانش مسکرا رہا تھا۔

اندر سے اُبلنے والے ایک زبردست قہقہے کو اس نے اپنے اندر ہی دبا لیا!

ڈوسرا رنگ

بعد از مرگ

یہ میرا دوسرا روڈ حادثہ تھا۔جس میں سامنے سے اوورٹیک کرنے والی ایک بکتر بند نما گاڑی نے میری چھوٹی سے کار کو اڑا کر رکھ دیا۔میں نے شدید جسمانی چوٹوں کی تکلیف کو محسوس کر کے کراہنے کی کوشش کی،تو مجھ سے آواز نہ نکالی جا سکی۔مگر یہ معاملہ چند ثانیے ہی رہا۔اگلے لمحے میں نے خود کو نہایت ہلکے پھلکے وجود میں ڈھلتے پایا۔

میں اب اپنی پچکی ہوئی گاڑی میں خود کو لہولہان دیکھ رہا تھا۔گاڑی کے اسٹیرنگ پہ دھرا میرا سر،اب جسم کے شانت ہونے کا عندیہ دے رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ روڈ کے اطراف سے گزرتی گاڑیاں رک چکی تھیں۔لوگوں کا جم غفیر میرے گرد جمع تھا۔لوگ افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔کسی نے میری جیب میں ہاتھ ڈال کر میرے بٹوے سے میری بنیادی معلومات حاصل کیں۔کوئی فون پر دوسری جانب یہ تفصیلات بتا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایمبولینس کے سائرن کی آواز گونجی۔کچھ لوگ اُدھر اُدھر ہوئے۔کچھ نے میرے جسم کو اٹھا کر اسٹریچر کے ذریعے ایمبولینس میں منتقل کیا۔ایمبولینس فراٹے بھرتی میرے آبائی شہر کی جانب روانہ تھی۔

میرے ہلکے پھلکے وجود کے اطراف میں نے دو عجب الخلقت مخلوق کے سائے سے دیکھے۔انھوں نے مجھے دنیا سے کہیں اور لے جانے کا مژدہ سنایا۔میرے لیے موت کا منظر کشف جیسا

تھا۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ چوں کہ میری موت ناگہانی ہے، اتفاقی ہے۔ میں اپنی اس ناگہانی موت کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کم از کم میرے سوئم تک اس کی اجازت دی جائی۔
وہ ماورائی مخلوق میری اس فرمائش پہ مخمصے میں پڑ گئی۔ کچھ کشمش و پیچ اور تھوڑی دیر باہمی مشورے کے بعد بالآخر انھوں نے میرا مطالبہ مان لیا۔
اب میں ایک ماورائی وجود کے ساتھ، اپنی موت کے بعد کے مناظر دیکھنے پر قادر اور آزاد تھا۔

میں نے دیکھا کہ آناً فاناً دارِ فانی سے میرے کوچ کر جانے کی خبر پہلے عزیز و اقارب اور پھر احباب تک بھی پہنچی۔ ایک غریب گھرانے کے بڑے مگر جواں سال بیٹے کی جواں مرگ نے قیامت طاری کر دی۔ ماں صدمے سے بے ہوش تھی، باپ غم سے نڈھال۔ بہنوں پہ غشی طاری تھی اور بھائی سوگوار۔ بیوی پر سکتہ طاری تھی۔ میری چھوٹی بچی اس سانحے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور بس یہی وہ ایک لمحہ تھا، جب مجھے اپنی بے وقت موت کا افسوس ہوا، اور دنیا کی تمام تر بدصورتیوں و بداعمالیوں کے باوجود مجھ میں ایک بار پھر جینے کی خواہش بیدار ہوئی۔
میں نے دیکھا کہ عزیز و اقارب خود غم سے بے حال ہوئے جاتے تھے اور اہلِ خانہ کو تسلی بھی دیے جاتے تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام دراصل گہرے غم اور خوشی کے مواقع پر ہی اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ جب خاندان، برادری کے بعد الطرفین رکھنے والے لوگ بھی یک جا ہو جاتے ہیں۔
میرے لہولہان جسم کو غسل دے کر تر و تازہ کر دیا گیا۔ شہر میں موجود میرے دوست احباب جمع ہونا شروع گئے۔ میں گزشتہ سولہ برس سے شہر سے دور تھا۔ سردیوں کی سالانہ تعطیلات میں چند ہفتے ہی بس شہر میں گزارتا تھا۔ وہ تھوڑا سا وقت بھی اپنے بچپن کے چند لنگوٹیوں کے ساتھ گزر جاتا۔ اس لیے شہر میں میری آشنائی زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود جان پہچان کے، دور پار کے بھی لوگ آرہے تھے۔
اس کی ایک وجہ شاید میری ناگہانی موت بھی تھی۔ میں کسی بم دھماکے میں نہیں مارا گیا

تھا۔میں کسی دہشت گردی کے واقعے کی نذر بھی نہیں ہوا تھا، جو ہمارے عہد کا علامتی مظہر بن چکا ہے۔ میں کسی نظریاتی جنگ کا شکار بھی نہ تھا، نہ کسی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔نہ میں خدا کی راہ میں مارا گیا تھا۔میں تو روڈ حادثے میں 'بے موت' مارا گیا تھا۔اس لیے مجھے شہید کہہ کر بھی خود کو تسلی نہیں دی جا سکتی تھی۔یعنی، مفت کی موت مرا۔

میرا جنازہ اٹھایا جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ کون کون کندھا دینے میں پیش پیش ہے۔ میری جنازہ نماز میں کل ملا کر کوئی سو، سوا سو لوگ موجود تھے۔میرے دو چار لنگوٹیے دوست آگے آگے تھے۔وہ غم سے بوجھل تھے۔ان میں سے ایک میری طرح افسانہ نگار بھی تھا، جو اپنی ہر کہانی لکھنے کے فوراً بعد میرے پاس مشورے کے لیے لے آتا۔اسے لگتا تھا کہ گویا اس کی سبھی کہانیاں جیسے ادھوری رہ گئی ہیں اور اب اس کا کوئی افسانہ مکمل نہیں ہو سکے گا۔دوسرے کا خیال تھا کہ میں ایک بے ضرر اچھا انسان تھا، اور اچھے انسان دنیا میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے (یعنی جو تا دیر زندہ رہے، اس کے اچھا انسان ہونے میں کمی رہ گئی ہے!!......میں اس بیان سے متفق نہیں)۔تیسرے کے خیال میں میرے باغیانہ خیالات میری بے وقت موت کا سبب بنے۔مجھے سماجی بہتری کی بجائے اپنے گھر اور اہلِ خانہ کی بہتری کا سوچنا چاہیے تھا۔مجھے چاہیے تھا کہ میں ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسے کماتا، اپنے بچوں کو مادی خواہشات کی تکمیل کرتا، اور پھر خدا کے حضور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا تو سب ٹھیک ہو جاتا۔میرے لیے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے میرے اس دوست کو خیال آیا کہ اسے اپنے بچوں کے لیے کچھ خریدنا بھی ہے۔اس لیے وہ جنازے سے جلد فارغ ہونے کی راہ تلاش کرنے لگا۔

میرے بے جان بدن کو مٹی کے حوالے کر کے سب واپس لوٹ آئے۔رات ڈھل چکی تو چائے نوش فرما کر سبھی سوگوار دلوں اور چہروں کے ساتھ بستر پہ آ لگے۔

اگلے روز تعزیت کا سلسلہ شروع ہوا۔میرے لیے یہ ہمیشہ سے کراہت آمیز رہا ہے۔جہاں ہر آنے جانے والا ایک ہی سوال ٹیپ کے مصرعہ کی مانند دہراتا رہتا ہے، "یہ سب کیسے ہوا؟" اور غم سے نڈھال لوگوں کو دن میں سو بار ایک ہی بات کو دہرانا ہوتا ہے۔افسوس کا ایک ہی انداز، تعزیت کے وہی الفاظ، ہمدردی کے ایک سے بول، دنیا کے فانی ہونے کا بے روح بیان......اس لیے

میں وہاں سے نکل پڑا۔

ہمارے عہد کا ایک نیا مظہر سوشل میڈیا ہے۔ جس میں سب سے نمایاں فیس بک ہے۔ معمول سے لے کر خصوصی واقعات تک سب اب فیس بک کے ذریعے ہی اظہار پاتے ہیں۔ اس لیے آج میں نے فیس بک اور سوشل میڈیا کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ میری موت کی خبر میرے حلقہ احباب تک پہنچ چکی ہے۔ چند دوستوں نے اسے اپنی وال پہ بھی شیئر کیا ہے۔ کچھ نے اس پر تعزیتی و تاثراتی نوٹ لکھا ہے۔ ان پوسٹوں پر مختصر تعزیتی کمنٹس کی بھرمار تھی۔ فیس بک نے ایک کمال یہ بھی کیا کہ کم ترین الفاظ کے ذریعے تیز رفتار معاشرے کو اظہار جذبات میں بھی آسانی فراہم کر دی ہے۔ جیسے کیسی کو ہیپی برتھ ڈے کہنا ہو تو HBD لکھ دینا کافی ہے۔ ایسے ہی تعزیت کے لیے RIP بہت ہے (جو Rest in Peace کا مخفف ہے)۔

میں نے گنتی کرنے کی کوشش کی۔ میری فرینڈ لسٹ میں بائیس سو سے زائد افراد بھرتی تھے۔ کل ملا کر 17 لوگوں نے اپنی وال پر میری موت پہ دکھ کا اظہار کیا تھا۔ ان 17 پوسٹوں پہ مجموعی طور پر 89 لائیک تھے، جن میں کچھ لوگوں نے روتا چہرہ اور کچھ نے دل کی سمائلیز پہ بھی کلک کیا تھا۔ جب کہ کل کمنٹس کی تعداد 244 تھی۔ جن میں اکثریت RIP والے کمنٹس کی تھی۔ کوئی کمنٹ دو سطروں سے زیادہ نہ تھا۔

لگ بھگ سبھی نے مجھے اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا۔ کسی کو میری تحریر پسند تھی، کوئی میرے مطالعے سے متاثر تھا، کوئی میری اشاعتی سلسلے سے خوش تھا، کسی نے مجھے اچھا ٹیچر بھی لکھا (یہ بات مجھے اچھی لگی)، کسی نے خلوص کی تعریف کی، کوئی بے تکلفی کو یاد کر کے غمگین ہوا۔ الغرض یہ ایسے کمنٹس تھے، جو کسی بھی مرنے والے کے لیے لکھے جا سکتے ہیں۔ بس نام ہٹا کر یہ تعزیت نامہ کسی کے بھی نام بھیجا جا سکتا ہے۔

ایک آدمی، بس اس ایک آدمی کا تعزیت نامہ ذرا مختلف تھا، جو صرف میرے نام تھا۔ وہ جو اب تک دوستی کے مراحل طے نہیں کر پایا تھا۔ جو اپنی تنہائی میں مخل اندازی کو پسند نہ کرتا تھا۔ جسے

میری بکواسیات بری لگتی تھی۔ جو نظریاتی طور پر بھی بہت کم اتفاق، اور بہت زیادہ اختلاف رکھتا تھا۔ مگر بس یار تھا...... فیس بکی یار۔ وہ شدید سوگ میں تھا، جیسے کہ میری لاش اس کے گھر سے اٹھی ہو۔

بہرکیف، کل ملا کر ساڑھے تین سو لوگ فیس بک پر ایسے تھے، جنھوں نے میری موت کا نوٹس لیا تھا...... روز سیکڑوں، ہزاروں انسان گم نامی کی موت مر جاتے ہیں، لاوارث سمجھ کر دفنا دیے جاتے ہیں۔ کہیں ان خاک نشینوں کا تذکرہ تک نہیں ہوتا۔ مجھے ساڑھے تین سو ایسے لوگ یاد کر رہے تھے جن سے میرا نہ خون کا رشتہ تھا، نہ کوئی قریبی دوستی تھی۔ سو، میں نے سوچا میں اتنا غیر اہم آدمی بھی تو نہیں!!

دل کے ہاتھوں مجبور، میں نے زنانہ کمنٹس پہ نظریں دوڑائیں۔ میں ڈھونڈتا رہا اپنی محبوباؤں کے جذبات۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میری ناگہانی موت پہ ان دوست محبوباؤں کا ردِعمل کیسا ہے!!

اتفاقاً سب سے پہلا کمنٹ جو میں نے دیکھا، وہ اس عورت کا تھا، جس سے میری شناسائی فیس بک کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ مجھ سے عمر میں دگنی بڑی اس عورت سے میں اس کے ادبی ذوق اور لازوال حسن کے باعث شدید متاثر تھا۔ اس نے میری موت پہ غالب کی وہ غزل اپنی وال پہ لکھ رکھی تھی، جو غالب نے اپنے بچے کی ناگہانی موت پہ لکھی تھی: 'کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور......' میں اس کی نشیلی آنکھوں میں سوگواری دیکھ سکتا تھا۔

ایک عورت، جس سے میں ابھی مل نہ پایا تھا، مگر اس کی فکری صلاحیت مجھے مہمیز دیتی تھی، دلی طور پر افسردہ تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ مل کر ہم دونوں ایک دوسرے کے دل کے قریب آ جاتے۔ پیار، بھروسہ اور اخلاق بانٹتے، وقت نے مگر یہ موقع گنوا دیا۔ میرے نام پہ اس کی آنکھ کا نم گوشہ مجھے بھلا لگا۔

ایک لڑکی مجھے اپنا اچھا دوست کہہ کر یاد کر رہی تھی۔ ایک نے لکھا کہ وہ میری تحریر اور شخصیت دونوں نے سے متاثر تھی۔ ایک نے مجھے اچھا انسان لکھا۔

میں مگر ڈھونڈ رہا تھا اس عورت کا ردِعمل جسے میں اس روئے زمین پہ سب سے زیادہ

چاہا، مگر سب سے کم اظہار کیا تھا۔ اسے مگر پتہ تھا کہ میں اس کے لیے کیا جذبات رکھتا ہوں۔ حالاں کہ وہ میری پہلی محبت نہ تھی۔ آخری بھی نہ تھی۔ اس کا حسنِ لازوال، اس کی شیریں آواز، اس کا ذوق وشوق، اس کے مزاج کا دھیما پن، گفتگو کی چاشنی، اس کی ذات میں محبت کا پھیلاؤ...... سراپا تعظیم تھی وہ، ایک آئیڈیل محبوب۔ میں نظر بھر دیکھ نہ پاتا تھا اس کو۔ اس کی تعظیم میں پلکیں جھک جاتی تھیں۔

ایک زمانے میں اسے میری تحریر پسند تھی۔ پھر نظریاتی راہیں الگ ہوئیں تو اس نے بے اعتنائی کی چادر اوڑھ لی اور میں اس کے احترام میں ایک طرف ہو رہا۔ وہ کمال کی شاعر تھی۔ میرے دل میں کہیں دبی دبی سی خواہش تھی کہ وہ یقیناً کوئی سوگوار نظم میرے نام کرے گی، اور میرے لیے یہی اس مرگ کا حاصل ہوگا۔ میں نے فیس بک کا کونا کونا چھان مارا۔ اس نے آج بھی ایک نظم شیئر کی ہوئی تھی...... مگر وہ میرے نام نہ تھی۔ جاتے جاتے کسی اور خاتون کی وال پہ ہونے والے کمنٹس پہ اس کا نام دکھا، جہاں اس کا ایک سطری تبصرہ تھا 'فطرت اسے اپنی امان میں رکھے......'۔ میں نے شدید کرب اور سوگواری سی محسوس کی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا، اچھا ہوا کہ میں مر ہی گیا۔

پھر کچھ واٹس اپ گروپ بھی تھے، جہاں مجھے دوستوں نے بھرتی کیا ہوا تھا۔ دو چار گروپس، جہاں میں بھی بحث مباحثے میں حصہ لیا کرتا تھا، میری موت پہ وہاں سوگواری چھائی تھی۔ لوگ اس بے وقت موت پہ دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ لوگ جو مجھ سے شدید نظریاتی اختلاف رکھتے تھے، ان کے ہاں بھی سوگواری کی سی کیفیت تھی، مگر کچھ ایسی کہ جیسے کسی کے ہاتھ سے شکار قبل از وقت پھسل جائے۔ ایک ایسی عورت بھی افسوس کا اظہار کر رہی تھی جس نے مجھے زندگی میں درخورِ اعتنا نہ جانا، بعد از مرگ وہ میری 'اچھی دوستی' کا دم بھر رہی تھی، مجھے اس پہ پیار بھرا غصہ آیا۔

کچھ محبوبائیں مگر فیس بک اور واٹس اپ پہ اظہار سے قاصر نہ تھیں۔ ان میں سے آٹھ برس پرانی ایک محبوبہ، جس کا میں واحد جذباتی 'سہارا' تھا، شدید سوگ اور سکتے میں تھی۔ اس نے باقاعدہ بیوہ کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔ الفاظ اور آنسو اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ وہ گہرے صدمے کی حالت میں تھی۔

ایک 'تازہ' محبوبہ بھی تھی، جس سے پینگیں بڑھائے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ

دکھ میں تو تھی، ساتھ ہی کہیں اسے غصہ بھی تھا، کہ میں ایسے کیسے جا سکتا ہوں، اسے مطلع کیے بغیر۔ حالاں کہ زندگی کی بے ثباتی کا جذباتی بیان اسے رام کرنے کو، میں نے کئی بار اس کے سامنے دہرایا تھا، مگر تب وہ اپنے صبر پہ تکیہ کیے رہی۔ اب بھی اسے لگتا تھا کہ میں نے جیسے کہ اسے جذباتی طور پر مغلوب کرنے کو یہ ڈراما رچایا ہے...... اس کے 'ہاں' کہتے ہی میں فوراً واپس آجاؤں گا!!۔

کچھ اور تحریریں بھی تھیں۔ کچھ میرے چاہنے والوں نے، کچھ نوجوانوں نے، کچھ پیاروں نے جو پیار کے اظہار کے بہ طور لکھی تھیں۔ مجھے لفظوں کے جادوگر اس دانش ور پہ پیار آیا جو سگریٹ کے کش کے ساتھ میرے لیے تعزیتی کالم لکھتے ہوئے ایک ایک لفظ کے انتخاب میں کئی ثانیے محو ہو جاتا۔ منٹوں بعد ایک فقرہ لکھتا، پھر مٹاتا، پھر لکھتا، پھر مٹاتا۔ اور بالآخر رات کے تیسرے پہر تین پیگ لینے کے بعد، کالم ختم کر کے، فیس بک پہ پوسٹ کرتے ہی اس کی آنکھ کے کناروں سے دو آنسو لڑھک آئے تو میں اپنے حصے کا گلاس اس کے سامنے خالی رکھ کر، وہاں سے نکل آیا۔

تیسرے دن میں نے کوئٹہ کا رخ کیا۔ جہاں میری چودہ سالہ علمی و عملی زندگی کا پڑاؤ تھا۔ میرے قریبی دوست، دشمن، محبوب سب یہیں پائے جاتے تھے۔ اٹھارہ، بیس برس کی مسلسل قلمی ریاضت نے مجھے وطن کے کونے کونے تک روشناس ضرور کروایا دیا تھا۔ میری صحافتی، علمی، ادبی و تعلیمی سرگرمیوں نے بیک وقت کئی جگہوں پہ مجھے معتوب و محبوب بنائے رکھا۔ اس کردار کو اب پرکھنے کا وقت تھا۔

کوئٹہ میں میری ناگہانی موت کا سب سے زیادہ صدمہ فطری طور پر اس ادبی حلقے کو پہنچا، جس سے میں فکری و عملی طور پر وابستہ تھا۔ دوست احباب صدمے کی کیفیت میں تھے۔ ایک دوسرے کو تسلی دے رہے تھے۔ صحافیوں نے بھی اس پر دکھ کا اظہار کیا۔ کالج نے، جہاں سے کہ میری روزی روٹی وابستہ تھی، حسبِ روایت وحسبِ توقع ایک دعا پہ قناعت کی۔ اندرونِ وطن بعض ادبی حلقوں نے تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا۔ جہاں شاعروں، ادیبوں نے دکھ کا اظہار کیا۔

''وہ ایک آدمی نہیں، ادارہ تھا''...... ''اس کا خلا برسوں نہیں بھرا جا سکے گا''...... ''اس نے دل سے وطن کی خدمت کی''......

الغرض، ایک بار پھر وہی روایتی تعزیت نامے جو نام کی تبدیلی کے ساتھ کسی کے لیے بھی پیش کیے جا سکتے تھے۔

اسی شہر کے ایک کونے میں کہیں اس عورت کو بھی میری ناگہانی موت کا پتہ چلا، جو جس نے میری جوانی کو با معنی بنایا تھا۔ مگر پھر میری نالائقیوں کے طفیل بیچ راہ میں مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے فون پہ خون میں لت پت میری تصویر دیکھی۔ ایک لمحے کو اسے لگا کہ جیسے میری ذات سے وابستہ اس کے سبھی زخموں کا کسی نے انتقام لے لیا ہو، مگر پھر اگلے ہی لمحے میری بند آنکھوں پہ نظر پڑتے ہی ایک تکلیف دہ احساس اس کے بدن میں سرایت کر گیا کہ یہ وہی آنکھیں تھیں جن پر کبھی وہ مرمٹی تھی۔ وہ آنکھیں، جو اس کے دل میں اتر گئی تھیں، جن آنکھوں سے اس نے خود کو پرستان کی ملکہ بنتے دیکھا تھا، وہ آنکھیں اب مند چکی تھیں۔ وہ دل، جس کی دھڑکن میں مستقل اس کا نام ثبت ہو چکا تھا، اب ہمیشہ کے لیے بند تھا۔ وہ دہن جس نے کبھی اس کے لیے کائنات کے نئے معنی کھولے تھے، بند ہو چکا تھا۔ وہ بدن جو کبھی اس کے لیے راحتِ جاں تھا، اب بے جان تھا۔ اس تعلق سے وابستہ تکلیف کے سبھی جھمیلے اب شانت ہو چکے تھے......

جھیل سی پلکوں پہ نمی اترنے سے پہلے ہی اس نے فون ایک طرف رکھا، اور پاس کھیلتے اپنے بچوں کی محبت میں محو ہو گئی!!۔

یہیں اسی شہر میں، تیزی سے بوڑھا ہوتا ایک دانش مند آنکھ پہ چشمہ ٹکائے اپنے سیل فون کی سکرین پہ میری تصویر کو حسرت سے تکتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا، جس نے مجھ میں اپنے خوابوں کا تسلسل دیکھنا چاہا تھا۔ میری تمام تر نااہلیوں کے باوجود جسے کامل یقین تھا کہ اس کے کندھے جھکنے سے پہلے میں اس کا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھانے کا اہل ہو جاؤں گا۔ ایک شفیق باپ کی طرح جو میری ہر خامی پہ پردہ ڈال دیا کرتا۔ کسی بے تکلف کی طرح ہر مشکل میں جو میرے پہلو میں کھڑا ہوتا۔ وہ جو بنا اظہار کے شدید محبت کے حصار میں رکھتا تھا۔ جو خود سمیت میری ذات پہ آنے والے پتھر بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا کرتا کہ کہیں میں کوئی جوابی وار نہ کر دوں۔ وہ جو میری مسلسل مجبتوں سے خائف ہو کر بھی مجھے محبت کا اہل بنائے رکھتا تھا۔ وہ جو ایسا کم نصیب تبریز تھا، جسے اپنے حصے کا رومی نہ مل سکا......

تیسرے دن کا سورج ڈھلنے لگا۔ سوئم مکمل ہوا۔ میرے گھر کے آنگن سے تعزیہ اٹھا لیا گیا۔ زندگی کو واپس معمول کی جانب لانے کی تگ و دو کا اہتمام ہونے لگا۔ اور مجھے کائنات کے کسی دوسرے نظام ہائے حیات کا حصہ بنانے کا وقت آن پہنچا۔

میں نے التجا کی کہ اس دنیا سے مستقل رخصتی سے قبل مجھے کچھ 'اعترافات' کی اجازت دی جائے۔

میں اپنی ماں سے یہ اعتراف کرسکوں کہ اس سے محبت کے اظہار میں، میں سدا کا بخیل رہا۔ میں اسے بتاسکوں کہ گھر میں ان کے معمول کے جھگڑوں کے باوجود اس کی الطافات کے باعث ہی میں کتاب سے دوستی نبھا پایا۔ سکول کے زمانے میں شمع کی روشنی میں جب رات گئے میں اپنا رسالہ لکھتا تھا، اور وہ کبھی پیار سے کبھی ڈانٹ کر مجھے سلانے آتی تھی، تو میری ساری تھکن دور ہو جاتی تھی۔ میرے دوستوں کے لیے اس کے گھر کے دروازے اور دستر خوان ہمیشہ کھلا نہ رہتا تو میں ایثار اور مروت کے معنی ہی نہ جان پاتا۔ میں گلیوں میں آوارہ گردی کرتا ایک عام سا لڑکا ہی ہوتا، اس کی دعاؤں کی چھاؤں اگر نہ مل پاتی......

میں اپنے باپ سے یہ اعتراف سے کرسکوں کہ باوجود اس کے کہ میں اس کا کماؤ پوت بیٹا نہ بن سکا، اس کے جھکے ہوئے کندھے مجھے ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

میں اپنی بہنوں سے کہہ سکوں کہ ان کے لیے نیم قبائلی سماج میں ان کے لیے سماجی آسانیاں پیدا کرنے کے چکر میں مجھے کیسی ہی لعن طعن سننی پڑی ہو، مگر وقت ملتا تو میں ان کے لیے اور سہولتیں پیدا کرنے میں ہرگز نہ جھجکتا۔ میں اپنے بھائیوں سے کہہ سکوں کہ میں ان کی بااختیار زندگی کا خواب دیکھتا تھا۔ انھیں اپنا دست و بازو خیال کرتا تھا۔

میں اپنی بیوی سے کہہ سکتا کہ میں نے اپنی زندگی میں جتنی عورتوں کو چاہا، وہ ان میں سب سے افضل ہے کہ اس نے مجھے مکمل برتا اور بھگتا تھا۔ میں اسے بتا سکتا کہ میں محبتوں کا اسیر تھا۔ سو، کبھی اسے بتا کر، کبھی چھپا کر مسلسل پیار کرتا رہا۔ وہ عورت مرد کے تعلقات سے متعلق روایتی خیالات سے

دامن نہ چھڑا سکی، اس لیے مجھے اپنی محبتیں اس سے چھپانی بھی پڑیں۔ محبت کرنا میرے لیے جس قدر باعثِ اطمینان تھا، اسے چھپانا اسی قدر باعثِ ندامت بھی۔ دراصل 'چھپانے' پہ مجبور کرنے کا عمل ہی اس اعزاز کو ندامت میں بدل دیتا تھا۔ یہ تکلیف دہ تھا، مگر اس کے باجود اس عورت کے احترام اور محبت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نے مجھے قبول کر کے جو احترام بخشا تھا، اس کے عوض میں اس کا مقروض ہی رہا۔ مجھے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کرنا تھا کہ چھ برسوں میں اس کی ذہنی بالیدگی میں، میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر رہا۔

مجھے خدشہ تھا مگر کہ میری بچی کی تربیت ان خطوط پہ نہ ہو سکے گی جو میں نے اس کے لیے سوچا تھا۔ میری بیوی ایک سادہ مزاج عورت تھی، جو روایتی طور پر مرد کے 'سہارے' کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔ وہ شاید بچی کو اب ایک سہمے ہوئے انسان کی صورت رکھے گی۔ وہ شاید اس میں کبھی وہ حوصلہ پیدا نہ کر سکے جو اس میں عورت مخالف سماج سے لڑنے کی طاقت پیدا کرتا۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے بچوں کو بس ایک ہی لفظ ، ایک ہی احساس، ایک ہی جذبے سے آشنا کرواؤں: آزادی۔ وہ آزاد فضاؤں میں اڑنا سیکھے، کوئی اس کے پر نہ کتر سکے۔ وہ ٹھوکر کھا کر، خود اٹھنے کا طریقہ سیکھے۔ وہ پیار میں دھوکہ کھا کر بھی وفا نبھانے کا سلیقہ سیکھے...... ایک امید کی کرن البتہ مجھے اپنے چھوڑے ہوئے واحد ترکہ کتابوں کی صورت نظر آئی، کہ وہ یہ سب یقیناً میرے بغیر بھی سیکھ لے گی، اگر اس نے کتاب سے دوستی کر لی۔

میں اپنے قریبی دوستوں سے کہہ سکوں کہ نجی زندگی میں کسی قسم کی مماثلت نہ ہونے کے باجود میں ان کی کمپنگی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ان کی بے تکلف محفل، زندگی کے پھیکے پن کو گھٹا دیتی تھی۔ اور سوشل میڈیا کے ذریعے دوست بننے والے نئے آشناؤں سے کہہ سکوں کہ میرے حقیقی دوست تو وہی ہیں۔ وہ جن میں نظریاتی ساتھی بھی تھے اور مخالف بھی، مگر جو اعلیٰ انسانی اقدار پر یقین رکھتے اور انہیں مقدم جانتے تھے۔ میں ان سب کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتا تھا جو لوگوں کی نجی اور فکری زندگی کا احترام کرتے تھے۔ اور اپنے اختلافات پورے احترام اور محبت کے ساتھ نبھاتے تھے۔

میں یہ اعتراف کرسکوں کہ عورتیں، کتابوں کی طرح میری زندگی کا لازمی حصہ رہیں۔ میری مختصر زندگی سے کتابیں اور عورتیں نکال دی جائیں تو میں صفر رہ جاؤں گا۔ میں نے (میری اپنی نظر میں) اپنی سب سے اچھی کتاب کسی عورت کے لیے لکھی، سب سے اچھی کہانی کسی عورت کی یاد میں لکھی، سب سے اچھا فقرہ عورت سے متعلق کہا، سب سے اچھے لمحے عورتوں کے پہلو میں گزارے۔ عورتیں، ہمیشہ میری سب سے اچھی دوست رہیں۔ عورت کا صبر، حوصلہ، اخلاص اور ایثار مجھے سدا اس کے قریب رہنے پہ مائل رکھتا تھا۔ اس لیے عورت کا سب سے قابلِ احترام، سب سے معزز، سب سے پیارا روپ میرے لیے محبوبہ کا ہی تھا۔ میں نے اپنی سبھی ساتھی عورتوں کو اپنی محبوبہ ہی بنا کے رکھا۔ پورے احترام، پورے خلوص اور بھرپور پیار کے ساتھ!!

میں اپنے بچپن کی اولین محبوبہ سے کہہ سکتا کہ اس کے ہاتھ کے لمس کا ذائقہ میں نے آج بھی سنبھال کے رکھا ہے۔ میری جوانی کو بامعنی بنانے والی محبوبہ سے کہہ سکتا کہ جتنی تکلیف تمھیں مجھ سے پہنچی، نادانستہ تھی، مگر تم سے پیار دانستہ تھا۔ تمہارا نعم البدل میں نے کہیں نہیں پایا۔

ممتا سے بھری اس عورت سے میں کہہ سکتا کہ تمہارے پیار نے مجھے اعتبار بخشا۔ تم نہ ہوتیں، تو تاعمر محبت کی ناکامی کا نوحہ پڑھتا رہتا۔

میں زندگی میں آنے والی ہر عورت، ہر وہ عورت جس سے میں نے پیار کیا، اور وہ عورتیں جن سے ابھی میں نے پیار کرنا تھا، سے کہہ سکوں کہ تم میری تخلیق کی مشترکہ اساس ہو۔ میں جو تھا، تمہارے ہونے سے تھا۔ ہر تعلق سے میں نے تخلیق کشید کی۔ عورت کے پہلو میں گزرے ہر لمحے نے مجھے تخلیقی عمل سے سرفراز کیا۔ ہر عورت میرے لیے محبوبہ کا روپ لیے، ممتا کے جذبے سے سرشار تھی۔ میں نے ان سب سے کائنات کو سمجھنا سیکھا، دنیا سے نمٹنا سیکھا۔ میں ان میں سے ہوں، میں انہی میں لوٹ جانا چاہوں گا۔

اور میری ناگہانی موت سے سب سے زیادہ نقصان میں رہنے والے اُس دانش مند سے کہوں کہ پیارے استاد، وقت مجھے مہلت دیتا تو تمہارے وقار کی طرح، میں تمہارے کندھوں کو کبھی جھکنے نہ دیتا۔ تمہارے خواب، مشترکہ اساس کے باوجود میری قامت سے بڑے تھے، سو میں ہمیشہ

پیش قدمی میں محتاط رہا۔ بس، محبتیں نبھاتا رہا، کہ ہمارے عہدِ خرابات میں یہی 'انقلابی' عمل رہ گیا تھا۔ وقت ملتا تو میں تم سے محبت کے تسلسل کے اجازت نامے کے ساتھ تمہارے سارے خوابوں کی تکمیل کا عہد لے لیتا۔

مگر مجھے بتایا گیا کہ دنیا کی زندگی بس ایک ہی بار ہے۔ اس میں واپسی کا کوئی آپشن نہیں۔ جو کہنا ہے، اسی زندگی میں کہہ ڈالو۔ جو کرنا ہے، اسی زندگی میں کر ڈالو۔
تبھی مجھ پہ یہ بھی منکشف ہوا کہ ماسوائے نومولود انسانوں کے قبل از وقت مرگِ ناگہانی دو سبب سے واقع ہوتی ہے: یا تو آپ بہت تیزی سے چلتے ہوئے وقت سے پہلے اپنے حصے کا کام کر لیں، یا پھر موجود ذمہ داریوں سے کوتاہی برتیں۔
اور مجھے یقین تھا کہ میں دوسرے سبب سے اس کا شکار ہوا تھا، سو حسرتوں کا لشکر اپنے ساتھ لے چلا تھا۔
بالآخر دنیا سے نکال کر مجھے میری حسرتوں سمیت کائنات کے بحرِ بیکراں کے حوالے کر دیا گیا۔

تکمیل کی راہ میں...

''تم نے مجھ میں جیون بھر دیا غزل، میں پھر سے جی اٹھا ہوں تمہارے پیار میں۔'' یہ کہہ کر شاعر نے اسے گلے لگایا اور فرطِ محبت سے بے تحاشا چومنے لگا تو غزل کی اچانک ہنسی چھوٹ گئی۔

شاعر نے ایک دم اسے خود سے جدا کیا اور منہ پھلا کر کہنے لگا، ''ہنستی کیوں ہو؟''

غزل نے ہنسی روکی اور مسکرا کر بولی، ''یوں ہی خیال آیا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تم کسی کے پیار میں مر رہے تھے، اور آج کسی کے پیار میں جی اٹھے ہو۔''

''پیار تو اصل میں جیون دیتا ہے پیاری، مارتے تو ہمیں پیار دینے والے ہیں جو اس آکسیجن کی سپلائی روک دیتے ہیں۔'' شاعر نے نہایت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور اس سے الگ ہو کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھا تو پیار تمہارے لیے آکسیجن ہے، کہیں سے بھی مل جائے؟۔''

''میرے لیے نہیں غزل، پیار انسان کے لیے آکسیجن ہے، ہاں چاہے کہیں سے بھی مل جائے۔ لیکن بات یہ ہے کہ پیار دینے والے کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس نے کہاں دینا ہے اور لینے والے کو بھی معلوم کہ اس نے کہاں سے لینا ہے۔'' شاعر نے یہ کہہ کر صوفے پر پڑا کوٹ اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا: ''محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے/تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے(۱)''......اور ''چلتا ہوں، پھر ملتے ہیں'' کہہ کر باہر نکل گیا۔

غزل وہیں صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔اس کے ذہن کے پردے پر ایک حسیں مگر ویران نوجوان کا عکس دھندلانے لگا جسے ابھی چند ماہ قبل اس کا ایک جاننے والا اُس کی کوٹھی پر لایا تھا۔

*****

"غزل جانی، ان سے ملو یہ ہے ہیں ہمارے نوجوان دوست علی شاعر۔ نام کے ہی نہیں کام کے بھی شاعر ہیں، البتہ کسی کے عشق میں آج کل کسی کام کے نہیں رہے...... ہاہاہا" ہمدم نے اپنے ساتھ لائے ہوئے دو اور دوستوں کے ساتھ ایک نوجوان کا تعارف کرواتے ہوئے قہقہہ لگا کر آنکھ ماری تو وہ مدعا سمجھ چکی تھی، جس کی تفصیل ندیم اسے فون پر بتا چکا تھا۔ندیم ہمدم اس کے پرانے شناساؤں میں سے تھا۔جو ہر ماہ ایک چکر لازماً اس کی کوٹھی کا لگا لیا کرتے تھے۔یہیں شراب پیتے،موج مستی کرتے اور جوانی کی تسکین کا سامان کرتے۔ہمدم نے اسے فون پر بتایا کہ ان کا ایک نوجوان دوست عشق کی چوٹ سے بری طرح گھائل ہوا ہے،خودکشی کی کوشش کر چکا ہے،دنیا سے بیزار ہے۔کافی عرصہ علاج معالجے کے بعد اب کہیں جا کر دوستوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا ہے،تمھارے پاس لاؤں گا،اسے زندگی میں واپس لاؤ،جو مانگو گی، ملے گا۔

'تو یہ ہے شاعر!' غزل نے اس کے سراپے پر نظر دوڑائی۔سر اور داڑھی کے بال بے ترتیب بڑھے ہوئے، چہرہ شکن آلود،بے زاری کا تاثر لیے ہوئے، ہمہ وقت سگریٹ ہاتھ میں جلتی ہوئی۔تیس برس سے کچھ ہی اوپر کی شاید عمر ہوگی۔

"عشق نے نکما کر دیا غالب/ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے......(۲)" نوجوان شاعر اپنے دوست کا تعارف کرانے پر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے گویا ہوا۔

"کوئی بات نہیں شاعر صاحب، آپ جہاں آئے ہیں یہاں کوئی نکما نہیں رہتا، آپ کی ساری چستی لوٹا کر بھیجیں گے۔"

غزل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔شاعر کے چہرے پر کوئی تاثر نہ آیا،اس نے پھر ایک گہرا کش لگایا۔

"دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا/ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ

جاویں گے کیا(۳)"

"لگتا ہے آپ سے گفتگو کے لیے بیت بازی سیکھنی ہو گی۔" غزل کے اس فی البدیہہ جواب پر خوب قہقہہ پڑا۔

"اچھا بھئی ہم اپنے ٹھکانے چلتے ہیں، آپ اپنی محفل جمائیں، آج شاعر غزل کے حوالے ہے۔" ہمدم یہ کہتے ہوئے خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کے باقی دونوں دوست کھڑے ہوئے اور بالائی منزل کی جانب چل دیے، جہاں ان کی مہمان نوازی کا سامان موجود تھا۔

*****

میز پر اہتمامِ ناؤ نوش ہو چکا، غزل نے جام بھر کر اس کے سامنے رکھا اور اپنا جام ہاتھ میں لیا تو شاعر نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا جام اٹھایا اور نعرہ لگایا،"چیئرز ٹو دی لوورز اینڈ لوزرز...... اپنے اپنے بے وفاؤں کے نام۔" یہ کہہ کر اس نے سارا جام ایک ہی گھونٹ میں انڈیل لیا۔

"کیا یہ آگ اس جام سے بجھ جائے گی پیارے شاعر؟" غزل نے ایک گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آہ!! کبیرؔ نے کہا تھا: میرے دل میں لگی آگ کوئی نہیں دیکھ سکتا/ سوائے اس کے جس کے دل میں آگ یہ آگ لگی ہو/ اور سوائے اس کے جس نے یہ آگ لگائی ہے۔"

غزل صرف مسکرا کر چپ رہی تو شاعر نے سگریٹ جلائی اور پہلا کش لگاتے ہوئے پوچھا، "آگ لگانے والے سے تو میں بھاگ کر آیا ہوں، تم بتاؤ تمہارے دل میں یہ آگ کہاں سے لگی؟"

اس کے سوال پہ غزل مسکرائی اور ایک سِپ لیتے ہوئے کہنے لگی،"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ آپ کے پاس دوست ہیں جو آپ کے غم کا مداوا کرنے کو یہاں لے آئے۔ سوچیے، ان کا کیا ہوتا ہوگا، جن کا نہ کوئی ہمدرد ہو، نہ جن کے غم کا کوئی مداوا۔"

"رونے والوں سے کہو، ان کا بھی رونا رو لیں/ جن کو مجبوریِ حالات نے رونے نہ دیا(۴)"، شاعر کے شعر پڑھنے پہ دونوں مسکرا دیے۔

گرمیوں کی رات رفتہ رفتہ ڈھلنے لگی، لاؤنج میں ایئر کنڈیشنڈ کی یخ بستگی کا احساس بڑھنے لگا۔ جوں جوں سرور چھاتا گیا، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔ غزل جو عموماً مردوں کے ساتھ اپنے نجی معاملات میں زیادہ کھلتی نہ تھی اور لیے دیے رہنے والی عورت تھی، شاعر کے شاعرانہ مزاج کے سامنے جیسے ڈھیر ہوتی چلی گئی۔ گھنٹہ بھر بعد جب جام پہ جام چل چکا تو غزل شاعر کے سامنے کھل چکی تھی۔ اس کے گھاؤ بھرنے کا اہتمام کرنے والی، خود اپنے گھاؤ کھول کر اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔

''میں بارہ سال کی تھی جب ایک ایکسیڈنٹ میں ڈیڈی کی موت ہوگئی۔ مجھ سے پانچ سال بڑا بھائی انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ جائیداد اور کاروبار پر چچا نے قبضہ کرلیا۔ لے دے کر یہ کوٹھی تھی جو مما کے نام پہ تھی، یہی باقی رہ گئی۔ چار سال بعد جب یہیں اسی کوٹھی میں مما کا مرڈر ہوا تو میں اس قابل ہو چکی تھی کہ گھر میں آنے جانے والے مردوں اور عورتوں کی آمدو رفت کے سبب کا اندازہ لگا سکوں۔ مما کے کچھ سرپرست جن میں کچھ سیاست والے، کچھ پولیس والے بھی تھے، آگے آئے اور اس کوٹھی کا انتظام سنبھالنا شروع کیا۔ یہ کوٹھی شہر کے کئی شرفا کے میلے کپڑے دھونے کا معروف ٹھکانہ بن چکی تھی، اس لیے وہ اس کی 'حفاظت' کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی لیے میں نے اسے 'لانڈری ہاؤس' کا نام دیا، یہاں لوگ اپنے میل لے کر آتے ہیں اور انھیں دھو کر جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے غزل خود بھی مسکرا دی اور آخری جام کی طرف ہاتھ بڑھایا ''سولہ سال کی عمر میں، میں خود کفیل ہو چکی تھی، مجھے سنبھالنے والے بھی بہت تھے، وہی جنھیں انگریزی میں 'شوگر ڈیڈی' کہتے ہیں۔ انھیں اور ان کے بچوں کو پالتے پالتے بارہ برس ہو گئے۔ یہ ان سب کے لیے ایک محفوظ گھر ہے، سوائے میرے......'' اس نے آخری سپ لیا اور ایک تلخ ہنسی ہنس دی۔

''دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے/اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔(۵)'' شاعر جو کب کا کئی جام لنڈھا چکا، سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں سختی سے کچل ڈالا۔

غزل نے اسے کمرے میں چلنے کو کہا مگر وہ وہیں صوفے پر لیٹ گیا۔

غزل بھی وہیں سیدھی ہو کر لیٹ رہی۔

*****

علی شاعر ایک پروفیسر باپ کا بیٹا تھا۔ تین بہنوں میں اکلوتا بھائی۔ ایک گھر کی علمی فضا اور دوسرا نام کا اثر، وہ ایک زبردست شاعر بنا۔ شہر کے شعری حلقوں میں اس کا خوب چرچا تھا۔ کئی لڑکیاں اس پہ فریفتہ رہتیں۔ اس کی شاعری کی اسیر ایسی ہی ایک خوبرو حسینہ سے دو تین برس اس کا خوب معاشقہ چلا۔ شاعر اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں بات ہو چکی تھی۔ لڑکی اس دوران ایک امریکن پلٹ امیر زادے سے شادی کر کے پیا دیس سدھار گئی۔ اور اس نے شاعر کو یہ سب امریکہ پہنچ کر بتایا۔

شاعر کی گویا دنیا لٹ گئی۔ ایسے میں اس کے بچپن کے حلقے کے دوست ندیم ہمدم و دیگر آگے بڑھے اور اسے سہارا دیا۔ جذباتی معاملات سنبھلے تو انھیں لگا کہ اب اسے جسمانی راحت بھی ملنی چاہیے، اسی خیال سے ندیم اسے غزل کے ہاں لے آیا۔ ندیم خود ایک بیوروکریٹ کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ بھی شاعری سے شغف رکھتا تھا۔ باپ کا غزل کی کوٹھی پہ آنا جانا تھا۔ اس نے کئی بار باپ کو گاڑی میں یہاں چھوڑا تھا۔ اسی دوران اسے اس کوٹھی کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوا۔

شہرِ اقتدار کے پوش علاقے میں واقع یہ کوٹھی اپنے نام اور کام کی نسبت سے خاصی معروف تھی۔ جلد ہی اس نے بھی یہاں کا سراغ لگا لیا اور باپ کے نام کی ضمانت پر یہاں آنے جانے لگا۔ اس کوٹھی میں کسی مستند ضمانت کے بغیر داخلہ ممنوع تھا۔

*****

اس رات کے بعد شاعر کا بھی یہاں آنا جانا لگا رہا۔ وہ ہر ہفتے کی شام آجاتا اور اگلے چوبیس گھنٹے وہیں پڑا رہتا۔ رات بھر جام پر جام چلتے اور دونوں اپنی اپنی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے وہیں لاؤنج میں ہی لیٹ جاتے۔ غزل کو اس کی یہ بات بھائی کہ اس نے کبھی نہ تو کسی لڑکی کا مطالبہ کیا نہ اسے شب بسری کی دعوت دی۔ حالاں کہ غزل نے اسے کئی بار اشاروں کنایوں میں دعوت دی کہ اس گھر میں اس کی جوانی کے لیے ہر نوع کا سامان موجود ہے، وہ جب چاہے اس کی خواہش کی تکمیل ہو سکتی ہے، مگر وہ ہمیشہ اس سے کنی کترا جاتا۔

لگ بھگ تین ماہ گزر چکے تھے۔

اب رات ہلکی ہلکی سرد ہونے لگی تھی۔

ایسی ہی ایک سرد رات میں جب خنکی بڑھ گئی تو غزل نے اس سے کہا،"لاؤنج میں خاصی ٹھنڈ ہوگئی ہے، چلو میرے کمرے میں چلتے ہیں۔"

شاعر نے اب کے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ لاؤنج کے عقبی حصے میں ہی غزل کا اپنا رہائشی کمرہ تھا۔ یہ سوویٹ نما اچھا خاصا طویل اور خوب سجا ہوا خواب نما تھا۔ دیواریں ساری رنگیلی اور خوبصورت پینٹنگ سے مزین۔ پہلے حصے میں ایک میز اور چند صوفے۔ یہ خاصا کھلا ڈھلا حصہ تھا۔ سامنے کھڑکی سے باہر آسمان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اس سے اگلے حصے میں بیڈ روم تھا، شاید وہی اس کے سونے کی جگہ تھی۔

کچھ ہی دیر میں خادمہ نے ناؤ نوش کا تمام سامان وہیں منتقل کر دیا۔

اس دوران شاعر، مشرقی دیوار میں لگی ایک پینٹنگ دیکھنے میں محو تھا۔ تصویر میں ایک ہی درخت کو دو حصوں میں دکھایا گیا تھا۔ دایاں حصہ سرسبز تھا، یہ محبت کے نیلے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا، اس کی شاخ پر ایک جھولا تھا جس پہ دو پرندے چونچ ملاتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ بایاں حصہ خزاں زدہ تھا۔ شاخیں پتوں سے خالی زرد آلود تھیں، اور پس منظر خود آلود تھا۔

کھڑکی کے پاس، دائیں ہاتھ پہ کتابوں کی رینک تھی۔ جس میں خاصی تعداد میں کتابیں نہایت سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر انگریزی کی کتابیں تھیں۔ چند ایک اردو کی شعری کلیات بھی جھلک رہی تھیں۔

غزل نے اسے آواز دی تو وہ پلٹا اور اس کے سامنے صوفے پہ ڈھیر ہوتے ہوئے کہا،"تمھارا آرٹسٹک ذوق تو خاصا اچھا ہے۔"

"میرا نہیں، میری مما کا۔ یہ پینٹنگز انھی کے زمانے کی ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ان کے لیے تحفتاً لاتے تھے۔ کچھ تو میں نے اتار دی تھیں، یہ مجھے اچھی لگی اس لیے رہنے دی اور لاؤنج سے اتار کر یہاں لے آئی۔"

''ہوں ں ں......'' شاعر نے جام اٹھایا اور سپ کے ساتھ ہی کش لگایا۔

''تم اپنے زخم کا حال کہو۔ کچھ گھاؤ بھرے؟''۔ غزل نے استفسار کیا۔

''ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست/ زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے (۶)''۔ شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں شعر سنا کر کش لگایا۔

''ہمم، دل ریش؟۔ ریش تو داڑھی کو کہتے ہیں ناں؟ یعنی داڑھی والا دل؟''

''ہاہاہاہاہا!!!......'' غزل کی اس بات پر شاعر بے ساختہ ہنس دیا اور ہنستا چلا گیا۔'' یہ ریش نہیں، رَیش ہے یار۔ رے کے اوپر زبر ہے: معنی دل فگار، زخمی دل۔''

''اوہووو۔۔۔اچھا، اچھا!!!۔'' غزل نے جھینپتے ہوئے تصحیح قبول کی۔

''ایک بات بتاؤ غزل......'' شاعر نے ذرا موضوع بدلنا چاہا۔'' تم اس ماحول میں جوان ہوئی ہو، دن بھر تمہارے سامنے یہی کچھ چلتا رہتا ہے۔ تمھیں کبھی کسی جسم کی چاہ نہیں ہوئی۔''

شاعر کے سوال پر غزل مسکرائی، جام اٹھایا اور ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہنے لگی،'' میں نے تمھیں بتایا تھا شاعر، میں بالغ ہوتے ہی شوگر ڈیڈیز کے ہاتھ لگی۔ انھیں میرے جذبات سے کوئی غرض ہی نہیں ہوتی تھی، وہ بس جواں جسم کے متلاشی تھے۔ دو چار برس میں ہی مجھے اس کا اندازہ ہو گیا۔ تب میں نے خود کو خود اس سائیکل سے نکالا اور ان کے لیے مزید جواں جسموں کا انتظام کر دیا۔ وہ خود بھی ایک بار جو جسم استعمال کر لیتے، اس کے لیے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی۔ اس لیے میں نے جلد ہی خود کو بس ان کی سہولت کاری تک محدود کر لیا۔ کبھی کسی بڑے صاحب کی کوئی فرمائش آجائے تو مجھ سے فرمائش کر دیتے ہیں، ورنہ میں جسم کی حدوں سے آگے نکل گئی۔''

''آہا!!!...... جسم کی حدوں سے آگے...... بات تو شاعرانہ ہے مگر جسم کی حد کیا ہے بھلا؟'' شاعر نے چسکا لیتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ بس یہ ہے کہ اس سب سے اتنی رقم میرے اکاؤنٹ میں آجاتی ہے کہ سال میں گرمیوں میں مہینہ دو مہینے میں دنیا گھومنے نکل جاتی ہوں۔ اس سے ماحول بھی بدلتا ہے اور اسی دوران مجھے پڑھنے کا بھی خوب موقع ملتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق مجھے سیاحت کے دوران ہی لگا

اور اس دوران بہت کچھ چاٹ ڈالا میں نے۔ ایک سال ایسے ہی یورپ کے کونے میں واقع ہنگری کے ایک جزیرے بدھا پیسٹ میں ایک نوجوان سیاح سے ملاقات ہوگئی۔ وہ عجب زندگی سے بھرا نوجوان تھا۔ ہم کوئی دس دن ساتھ رہے؛ ایک ہی موٹیل کے ایک ہی کمرے میں...... اور اس نے مجھے زندگی سے بھر دیا۔ وہ واحد مرد تھا، جس کے ساتھ سوتے ہوئے میں نے اپنا جسم بخوشی اس کے حوالے کیا، شاید اس لیے کہ پہلی بار میں ایک ایسے مرد کے ساتھ سوئی جو مجھے دل سے اچھا لگا، جب پہلی بار اس میں لین دین کا کوئی معاملہ نہ تھا، اس لیے میں نے پورا اپنا آپ اس کے حوالے کیا۔ اس کے بعد جب بھی کہیں شب بسری پہ معمور ہوئی، میں جیسے بنا جسم کے تھی۔ مجھے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے میرا آدھا جسم وہیں بڑھا پسٹ کے جزیرے میں کہیں رہ گیا ہے، میں جیسے ادھوری رہ گئی ہوں۔"

"تو تمھیں کبھی تکمیل کی چاہ نہ ہوئی؟"۔ شاعر نے مسکرا کر اس کی اور گہری نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سب خود ادھورے جسم، ادھوری روحیں، ادھورے خواب لیے پھر رہے ہیں، کون کس کی تکمیل کرتا پھرے۔"

"دو ادھورے حصے مگر مل کر ایک حصہ تو مکمل کر سکتے ہیں۔" شاعر کی اس بات پر غزل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اسے شاعر کی آنکھوں میں جنس کی مردانہ ہوس کی چنگاری نظر آئی۔ مگر ایک شعلے کی طرح وہ جل کر بجھ گئی۔ شاعر نے اس کی نظر مکمل ہونے سے پہلے ہی نظریں بدل لیں اور سگریٹ کا اگلا کش لیتے ہوئے اس کے چہرے پر وہی ابدی لاابالی چھا گئی۔

"شاعر، تمھیں لگتا ہے کہ محبت، جنس کی اسیر ہو سکتی ہے؟" غزل نے مزید لاپرواہی برتنے سے قبل ہی اس پہ فوراً ہی سوال کا جال پھینک دیا۔

"محبت وہ چھلنی ہے غزل، جو جنسی عمل کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔" شاعر نے اسی لاپرواہی سے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "تم اسے اسیری کہو یا کچھ اور، مگر یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جنسی عمل اگر محبت سے خالی ہو تو یہ محض حیوانی سطح کا ایک جذبہ رہ جاتا ہے۔ یہ تو جانور بھی کرتے

ہیں؛ بنا کسی احساس کے، بنا کسی جذباتی لگاؤ کے۔ دو انسان مگر جب اس عمل سے گزرتے ہیں تو وہ ایک باریک مگر نہایت نازک دھاگے سے جڑتے چلے جاتے ہیں، میں اسی کو محبت کی تکمیل کا عمل کہتا ہوں۔ وہ جو تم نے کہا، جسم کی حد سے آگے...... جسم کی حد جہاں مکمل ہوتی ہے، وہیں سے محبت آغاز کرتی ہے۔ کچھ لوگ محبت سے آغاز کر کے اِس طرف آتے ہیں، کچھ لوگ یہاں سے ہو کر اُس طرف جاتے ہیں، البتہ کچھ اس کی حد تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیتے ہیں، اس لیے وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ہمارے اردگرد اکثریت ایسی ہی ہے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ تب غزل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا"تو تم خود کو اس اکثریت سے الگ سمجھتے ہو؟"

"ہاں، کیوں کہ میں جسم کی حد سے ہی محبت کی سرحد میں داخل ہوا۔ میں جب دُعا کے جسم کے سراب میں داخل ہوا تو مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس کی حد کہاں ہوگی۔ دُعا سراپا جسم تھی۔ لیکن وہ جسم کی حد سے آگے نہ بڑھ پائی۔ ہم نے جب جسموں کی حد پار کی تو آگے محبت کا جہاں ہمارا منتظر تھا، میں اُس کے سحر میں گم ہو گیا، اور جب مڑ کر دیکھا تو وہ وہیں سے لوٹ چکی تھی، میرا سفر اس سے آگے کا تھا۔" شاعر جیسے دور کہیں یادوں کی بازگشت میں کھو چکا تھا۔

"اور تمھاری باتوں سے لگتا ہے کہ میں تو جیسے جسم کی حد کو بھی نہیں پہنچی تھی، میں جیسے بیچ منجھدار میں تھی کہ میری پتوار کھو گئی......" غزل کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دو آنسو اس کی پلکوں پہ ڈھلک آئے۔

"غزل ل ل ل......" شاعر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ میں ادھورا جام لیے وہ اس کی طرف اٹھ آیا۔ اُس کی پلکوں سے پہلے آنسو پونچھے اور پھر اپنے ہونٹ وہاں رکھ دیا۔ غزل کے حلق سے ایک سسکی سی نکلی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ لیا۔ شاعر کے ہاتھ سے جام چھلک اٹھا۔ شاعر کے ہونٹ، غزل کی پلکوں سے ہوتے ہوئے اس کے رخسار اور پھر لبوں تک آپہنچے...... اور جام چھلک پڑا۔

*****

اس کے بعد اگلی چند ملاقاتوں میں دونوں قریب آتے چلے گئے۔شاعر کی راتیں اب اکثر غزل کی بانہوں کی نذر ہو جاتیں۔مگر اس دوران وہ جسم کی سرحد کے اگلے پڑاؤ کی طرف نہ بڑھ پائے۔شاعر نے ایسی ایک آدھ کوشش بھی کی تو غزل نے اسے پسپا کر دیا۔مگر تعلق کی ان دیکھی ڈور بندھتی چلی گئی۔

ایسی ہی ایک رات، غزل کے بیڈ روم میں گزار کر شاعر صبح جب تازہ ہو کر نکلنے لگا تو اس نے غزل کو بانہوں میں بھر لیا اور فرطِ محبت سے پکار اٹھا،"تم نے مجھ میں جیون بھر دیا غزل' میں پھر سے جی اٹھا ہوں تمھارے پیار میں۔"

یہ کہہ کر شاعر نے اسے گلے لگایا اور فرطِ محبت سے بے تحاشا چومنے لگا تو غزل کی اچانک ہنسی چھوٹ گئی۔

شاعر نے ایک دم اسے خود سے جدا کیا اور منہ پھلا کر کہنے لگا،"ہنستی کیوں ہو؟"

غزل نے ہنسی روکی اور مسکرا کر بولی،"یوں ہی خیال آیا کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تم کسی کے پیار میں مر رہے تھے، اور آج کسی کے پیار میں جی اٹھے ہو۔"

"پیار تو اصل میں جیون دیتا ہے پیاری، مارتے تو ہمیں پیار دینے والے ہیں جو اس آکسیجن کی سپلائی روک دیتے ہیں۔" شاعر نے نہایت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور اس سے الگ ہو کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا تو پیار تمھارے لیے آکسیجن ہے، کہیں سے بھی مل جائے؟"

شاعر نے اُس کے جواب میں شعر سنا کر"چلتا ہوں، پھر ملتے ہیں" کہہ کر روانہ ہوا، تو غزل نے اُس کے چہرے پہ اُسی افسردگی اور بے اعتنائی کا عکس دیکھ لیا، جو پہلے دن اُس کی کوٹھی پر آتے ہوئے اس نوجوان کے چہرے پر عیاں تھی۔

اس لیے صوفے پر ڈھیر اُس کی یادوں میں محو ہو کر، اسے محسوس کرتے ہوئے وہ کچھ ملول سی ہو گئی۔

*****

سردیاں اپنا جوبن دکھا رہی تھیں۔ اُس روز ہفتے کو صبح سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ شہر سرد ہواؤں کی لپیٹ میں تھا۔ غزل حسبِ معمول دیر سے اٹھی اور کمبل میں پڑے پڑے فون اٹھا کر دیکھنے لگی۔ حسبِ معلوم شاعر کا صبح بخیر کا پیغام موجود تھا: "مسکراؤ کہ صبح کی یخ بستگی کو کچھ گرمی میسر آئے۔" اور غزل بے اختیار مسکرا اٹھی۔ گذشتہ کئی مہینوں سے وہ اس پیغام کی عادی ہو چکی تھی۔ شاعر ہر صبح ایک خوب صورت فقرے سے اس کی صبح کا آغاز حسین بنا دیتا تھا۔ یہی وہ اولین حرکت تھی، جس نے اُسے اس مختلف نوجوان کی طرف متوجہ کیا تھا اور پھر وہ اُس کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔

ابھی وہ تازہ دم ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی ہی تھی کہ فون پہ شاعر کے پیغام کی گھنٹی بج اٹھی، جو اُس نے ایک مخصوص رِنگ ٹون میں رکھی ہوئی تھی۔ اس نے فون آن کیا۔ پیغام میں ایک نظم تھی:

"خوشبو کی پوشاک پہن کر

کون گلی میں آیا ہے

کیسا یہ پیغام رساں ہے

کیا کیا خبریں لایا ہے

کھڑکی کھول کے باہر دیکھو

موسم میرے دل کے باتیں

تم سے کہنے آیا ہے!!" (۷)

وہ مسکرائی اور فوراً اسے فون ملایا، "کہاں ہو شہزادے؟"

"اپنے دل کی کھڑکی کھول کے دیکھو رانی، وہیں کہیں آس پاس پاؤ گی۔" سامنے سے اسی شگفتگی سے جواب آیا۔

"اِس موسم میں صرف شاعری سے بہلاؤ گے کہ درشن بھی کراؤ گے؟"

"یہ سوال ہے کہ دعوت؟"

"حکم سمجھو۔"

"تعمیل ہوگی۔"

گھنٹے بھر میں وہ گاڑی لے کر اس کے دروازے پر موجود تھا۔ غزل تیار ہو چکی تھی۔ شاعر کے پہلو میں میں آ کر بیٹھی۔

اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور پوچھا، "کہاں کے ارادے ہیں؟"

"میرا خیال تھا آج تم پوچھو گے: کیا ارادے ہیں؟" غزل نے معنی خیز مسکراہٹ سے اس کی اور دیکھتے ہوئے کہا تو شاعر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہا،

"لگتا ہے آج غزل شاعر کے ہاتھوں نظم ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

"اتنی مشکل شاعرانہ علامتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں...... ٹیکسلا چلتے ہیں۔"

"پھر تو لگتا ہے آج نظم نہیں، آزاد نظم ہونا ہے۔" شاعر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

نظروں کے جام بھر گئے، چھلکنے کو بے تاب ہوں جیسے!!

*****

ہوا میں ہلکی خنکی اور آسمان پہ چھائے بادلوں نے ٹیکسلا کی وادی کو کچھ اور ہی رومان پرور بنا دیا تھا۔ وہیں سرسبز پہاڑیوں کے بیچ چلتے چلتے تھک کر وہ ایک گھنے درخت کی اوٹ لے کر بیٹھے تو بدھا کا ذکر چھڑا۔

تب غزل نے پوچھا، "بدھا میں کتنی شانتی ہے ناں؟ اور اس نے کیسی عظیم آفاقی سچائی دریافت کی تھی کہ، سب دکھ ہے!!"

"نوجوان سدھارتھ اصل میں جسم کی سرحد پر پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ گیا تھا۔ میرا ماننا ہے کہ بدھا جسم کی کٹھائیوں کو عبور نہیں کر پایا، یہ شکست اسے گہرے دکھ سے دوچار کر گئی، اس لیے پوری کائنات اس کے لیے دکھ کا عکس بن گئی۔"

"کیسی فضول بات ہے، تم ایک عظیم کائناتی سچ کو محض ایک معمولی جسمانی سرگرمی سے جوڑ رہے ہو؟"

"میری جان، جسے تم معمولی کہہ رہی ہو، دراصل وہی آفاقی سچائی ہے۔ پیٹ کی بھوک کے بعد، دنیا کے عظیم پیغمبر، عظیم فلاسفر، عظیم آرٹسٹ اسی کی کوکھ سے جنمے ہیں۔ جسمانی یا جنسی سرگرمی

کوئی معمولی اور معمول کی بات نہیں، یہ عظیم کائناتی کوڈز کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے اور انسانی شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ بھی۔ بدھا اس حقیقت کا سامنا نہیں کر سکا اور بھاگ کھڑا ہوا، اسی لیے اس کی شخصیت اور تعلیمات میں کجی رہ گئی ہے۔"

"یار مجھے سمجھ نہیں آتا ایک جنسی سرگرمی، انسانی شخصیت کی تکمیل میں بھلا کیا کردار ادا کر سکتی ہے۔"

"اچھا ایک منٹ......" یہ کہہ کر شاعر کھڑا ہوا اور اس کے آمنے سامنے آ گیا۔ "اچھا یہ بتاؤ یہ درخت اتنی مضبوطی سے کیسے قائم ہے؟"

"کیوں کہ اس کی جڑیں مضبوطی سے زمین میں پیوست ہیں۔"

"ایگزیکٹلی...... اچھا تم سمجھو یہ درخت ایک انسانی شخصیت ہے۔ جڑیں دراصل جنسی عمل ہے، جس طرح ہر درخت کی جڑیں ہوتی ہیں، ایسے ہر انسان جنسی عمل سے گزرتا ہے۔ لیکن جس درخت کو پانی نہ ملے، اس کی جڑیں جلد سوکھ جاتی ہیں اور درخت یا تو ختم ہو جاتا ہے یا بے ثمر رہ جاتا ہے، یہ پانی سمجھو محبت ہے، جو اس کی جڑوں کو یعنی جنسی عمل کو مضبوط بناتا ہے، اور اس کی شخصیت کو ثمر آور۔ جس انسان کی شخصیت میں محبت کا پانی نہ ہو، اس کا جنسی عمل سمجھو بے جڑ ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت بے ثمر۔ شخصیت تبھی تکمیل پاتی ہے جب اس کی جڑوں کو مسلسل تازہ پانی ملتا رہے۔"

"کمال ہے یار۔ تمھیں تو فلسفی ہونا چاہیے تھا۔"

"شاعر، فلسفی نہ ہو تو اسے بھی بے ثمر ہی سمجھو۔"

اس کی اس توجیہہ پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ آگے کو نکلے تو گفتگو کے دوران انھیں احساس ہی نہ ہوا کہ وہ کتنی دور نکل آئے۔

راستے میں غزل گویا ہوئی، "شاعر، یہ بتاؤ محبت بار ہا کیسے ہو جاتی ہے؟ ایک ہی شخص مسلسل

بار بار محبت کا دعوے دار کیسے ہوتا ہے؟ یہ شعلہ بجھ کر پھر کیسے روشن ہو جاتا ہے؟ یہ پودا سوکھ کر پھر کیسے ہرا ہوتا ہے؟"

شاعر مسکرایا اور کہا،"اصل میں محبت بارہا نہیں ہوتی، بار بار نہیں ہوتی، نہ اس کا شعلہ بجھتا ہے نہ یہ پودا سوکھتا ہے۔ یہ ایک ہی بار ہوتی ہے، اس کے بعد تو اسے بحال رکھنا ہوتا ہے، یہ شعلہ جل اٹھے تو اسے مدہم پڑنے نہیں دینا ہوتا، یہ پودا ہرا ہو تو اسے سوکھنے نہیں دینا ہوتا۔ محبت تو خود ایک دریا ہے جانم، اس لیے کسی تعلق کی بارش روٹھ بھی جائے تو اس کا پانی کم نہیں ہوتا...... آہ، اس پہ حسب حال نظم یاد آ گئی، چلو نظم سناتا ہوں۔"

شاعر نے یہ کہہ کر گاڑی کے میوزک کی آواز کم کی اور نظم سنانے لگا:

"محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہونے میں
تو سُر قائم نہیں ہوتا
محبت ایسا شعلہ ہے
ہوا جیسی بھی چلتی ہو
کبھی مدہم نہیں ہوتا
محبت ایسا رشتہ ہے
کہ جس میں بندھنے والوں کے
دلوں میں غم نہیں ہوتا
محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو

تو یہ محرم نہیں ہوتا

محبت ایسا دریا ہے

کہ بارش روٹھ بھی جائے

تو پانی کم نہیں ہوتا"(۸)

غزل مسکرا کر یوں اس کی اور دیکھنے لگی جیسے سب سوالوں کے جواب مل گئے ہوں۔ جیسے بپھری موجوں میں سکون در آیا ہو۔

ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تو شاعر نے گاڑی کو ایک جانب روک دیا۔ سامنے ٹیکسلا کے کھنڈرات تھے۔ وادی پر چھائے ہوئے بادل برسنے کو بے تاب تھے۔ ذرا سی گرج ہوئی اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ دن، شام کی دہلیز پہ آ لگا تھا۔ گاڑی میں لگے ہوئے ہلکے میوزک میں گیت کی دھن بدلی تو لتا کی مدھر آواز میں گیت جھلملانے لگا،" لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو......" دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب یوں دیکھا، جیسے کسی نے شرارتاً فرمائشی گیت لگا دیا ہو۔

آنکھوں کے جام ٹکرائے تو دونوں کو احساس ہوا کہ یہ تو کب کے چھلک چکے۔ بدن کی سرحد سامنے تھی۔ جسم گویا جسم کو صدا دیتا تھا۔ غزل غیر ارادی طور پر شاعر کی بانہوں میں سمٹ آئی، اور یوں سمٹنے لگی گویا نظم ہوتی جا رہی ہو۔

باہر بادل گرجے اور غزل اس کی بانہوں میں مزید سمٹ آئی تو شاعر زیرِ لب گنگنانے لگا:

" گلے لپٹے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے/ الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے......(۹)"

غزل اور سمٹ گئی۔ شاعر نے غزل کی پیشانی پہ بوسہ دیا تو گویا وہ پگھلتی چلی گئی۔ باہر بادل زور سے برسنے لگے اور گاڑی کے اندر دو جسم تکمیل کے مرحلے میں داخل ہوئے۔ شاعر کا بدن غزل کے اوپر جھکا تو اچانک اس کے ذہن کے گوشے میں ایک آنکھ کھلی اور اس نے خود کو بدھاپسٹ کے جزیرے میں پایا، جہاں وہ ایک اجنبی سیاح کی بانہوں میں اپنا بدن چھوڑ آئی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے بدن کا بقیہ حصہ آن ملا ہے اور وہ تکمیل پانے کو ہے!!

*****

ٹیکسلا سے واپسی پہ وہ رات گئے گھر پہنچے تو شہر میں چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ دونوں کچھ کھائے پیے بنا، محض تازہ دم ہو کر بستر میں گھس گئے اور پھر کچھ ہوش نہ رہا کہ کب دو قالب' یک جان ہوتے چلے گئے۔

صبح غزل حسبِ معمول دیر سے جاگی تو شاعر جا چکا تھا۔ اس نے سرہانے پڑا فون اٹھایا۔ شاعر کا پیغام موجود تھا:

"یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو/تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ"(۱۰)

وہ بے اختیار مسکرا دی۔

تازہ ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آ کر اس نے پہلا میسج کیا: "آج کا دن کچھ مختلف ہے۔ میری سوکھی جڑوں کو پانی دینے کا شکریہ۔"

اس نے ابھی ٹوس لیا ہی تھا کہ شاعر کا جواب آیا:

"عشق منت کشِ قرار نہیں

حسن مجبورِ انتظار نہیں"(۱۱)

ابھی اس نے پیغام پڑھا ہی تھا کہ اگلا میسج آ گیا:

"فیض کی اس غزل کا ایک اور شعر ہے: 'اپنی ہی تکمیل کر رہا ہوں میں......'، لیکن چھوڑو، اگلا مصرعہ نہیں سناتا کہ وہ حسبِ حال نہیں۔"

غزل نے مسکرا کر فون میز پر رکھا۔ جوس لیتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا اور سوچنے لگی، آج دن کس قدر روشن ہے!!

*****

پھر یوں ہوا......

کہ اگلے ہفتے شاعر نہیں آیا۔

غزل نے اس کی کمی شدت سے محسوس کی۔

گذشتہ چھ ماہ میں یہ اس کا پہلا ناغہ تھا، اور اُس نے اِس کی کوئی اطلاع بھی نہیں کی تھی۔
اُسے مناسب نہیں لگا کہ وہ خود اسے فون کر کے پوچھے۔
رات کوٹھی کے معمولات میں بیت گئی۔
صبح اسے شاعر کا معمول کا پیغام بھی نہ آیا تو اسے کچھ تشویش سی ہوئی۔
اُس نے ہمدمؔ کو فون ملایا۔
''ہمدمؔ، تمھارے شاعر کا کیا حال ہے؟''
''ارے غزل بیگم، تم نے کمال کر دیا۔ شاعر کو پھر سے زندہ کر دیا۔ کل ہی دوبئی مشاعرہ پڑھنے گیا ہے۔''
''اچھاااا۔۔۔مجھ سے ذکر نہیں کیا اس نے۔'' غزل کے لہجے میں اداسی در آئی۔
''تم سے؟؟؟ ارے بھئی ہم سے بھی ذکر نہیں کیا۔ کوئی نئی نویلی شاعرہ ہاتھ آئی ہے، سنا ہے اسی کے پلو سے لگ کر گیا ہے۔ ابھی کہاں ہاتھ آئے گا، واپس آنے دو، مل کر دادِ عیش دیتے ہیں اسے۔'' ہمدمؔ نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔
''ہاں۔۔۔'' غزل نے فون رکھا تو زوردار چھناکے کی آواز آئی۔
اُس نے چونک کر دیکھا، بے دھیانی میں فون میز پر رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ گلاس سے ٹکرا گیا تھا جو فرش پر گر کر کرچی، کرچی ہو چکا تھا۔
اُس نے حیرت سے زمین کی اور دیکھتے ہوئے سوچا؛ گلاس فرش پہ چکنا چور ہوا ہے، تکلیف دل میں کیوں اٹھی!!

کچھ ہی دیر میں کوٹھی کے معمولات کا آغاز ہو گیا۔ ایک سیاست دان کا جوان بیٹا ایک خوبرو دوشیزہ کو پہلو میں لیے پورچ میں کھڑی گاڑی سے برآمد ہوا۔ غزل لاؤنج سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ لڑکا اور لڑکی خوش گپیاں کرتے ہوئے اندر داخل ہو کر بالائی منزل کی اور چل دیے۔ زندگی معمول پہ لوٹ آئی۔

غزل نے فون اٹھایا اور شاعر کو پیغام لکھا:

''شعر حسبِ حال تھا، مگر اب اس میں زمانہ بدلنا پڑے شاید:

اپنی تکمیل کر رہا 'تھا' میں/ ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں''

میسج بھیج کر اس نے اگلا میسج ٹائپ کیا:

''ویسے غزل کا مقطع بھی حسبِ حال ہے:

فیضؔ زندہ رہیں، وہ ہیں تو سہی/ کیا ہوا اگر وفا شعار نہیں''

میسج بھیج کر اس نے فون میز پر رکھا۔ خادمہ تب کر آ کر ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں سمیٹنے لگی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ کچھ لمحے خالی دماغ ہو کر وہیں کھڑی رہی۔

پھر ایک توقف کے بعد، وہ کچھ سوچ کر پلٹی۔ فون اٹھا کر ایک اور میسج ٹائپ کرنے لگی:

''سنو، اِس غزل کا مقطع تم ہی تھے، غزل تمام ہو چکی۔ شاعر تو اپنی جڑوں کے لیے کہیں سے بھی پانی لے لے گا، غزل کی جڑوں کو شاید اور کوئی پانی راس نہ آئے، اس لیے پیارے شاعر! لوٹ آنا، اپنی غزل کی جڑوں کو پانی دیتے رہنا، غزل کو نظم کرتے رہنا۔''

میسج بھیج کر وہ مسکرائی۔ اُسے نہایت ہلکے پن کا احساس ہوا۔ وہ اسی طرح واپس کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ باہر دو اور گاڑیاں داخل ہوئیں۔ جن سے تین، چار جوڑے ہنستے مسکراتے برآمد ہوئے۔

اس نے مسکرا کر آسمان کی اور دیکھا۔

باہر کا منظر اجلا تھا۔ مطلع صاف تھا۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ سورج نکل آیا تھا۔ زندگی لوٹ آئی تھی۔

*****

حواشی

۱۔حفیظ ہوشیار پوری

۲۔اسداللہ خاں غالبؔ

۳۔اسداللہ خاں غالبؔ

۴۔سدرشن فاخرؔ

۵۔گم نام

۶۔خواجہ میر دردؔ

۷۔امجد اسلام امجدؔ

۸۔امجد اسلام امجدؔ

۹۔شادؔ لکھنوی

۱۰۔احسان دانشؔ

۱۱۔فیض احمد فیضؔ

مرجھائے ہوئے گوار رخ

اُس کا پیغام میرے لیے حیران کن تھا!

شاید اِس لیے بھی کہ گزشتہ کئی برسوں کی ہماری شناسائی بس دُور کی دُعا سلام کی حد تک ہی رہی تھی۔ وہ ایک ٹی وی چینل میں کام کرتی تھی، اور میں لکھنے پڑھنے کے جس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، اُس کی اِن اسکرین والوں سے ذرا کم ہی بنتی تھی۔ پھر اُس کے معصوم سے چہرے پر سجی گہری آنکھوں کے سوا، اُس کی جانب متوجہ ہونے کی اور کوئی خاص توجیح بھی نہ تھی۔ اپنے شوخ لہجے اور دلفریب مسکراہٹ کے باوجود اُس کی گہری آنکھوں میں 'فاصلے' کا ایک واضح پیغام ہر پل موجود رہتا تھا۔ سو ہماری ملاقاتیں روایتی حال حوال سے آگے کبھی نہ بڑھ سکیں۔ اس کے باوجود جب اُس نے اپنی کہانی لکھنے کے لیے میرا انتخاب کیا، تو ظاہر ہے میرے لیے اس میں حیرت کا پہلو یقینی تھا۔ (مجھے یقین تھا کہ اُس نے میری لکھی ہوئی کوئی کہانی نہیں پڑھی تھی)

لیکن میری کسی حیرت کو خاطر میں لائے بغیر اُس کا سادہ سا حکم تھا کہ میں اُس کی کہانی جلد سے جلد لکھ کر اُس کے حوالے کر دوں۔ اُس کے بقول، وہ اُن دنوں شدید ذہنی کرب اور دباؤ کا شکار تھی، اور اپنی موجودہ نوکری کو جلد خیرباد کہنے والی تھی۔ جب کہ میرا کہنا تھا کہ میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ ہے، اس لیے مجھے اِس کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا۔ کسی اور کی کہانی کو کچھ یوں بیان کرنا کہ ہر پڑھنے والے کو وہ اپنی ہی کہانی لگے، میرے لیے کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ یہ تو کسی اور کی زندگی کو جینے کا

تجربہ ہے، کسی اور کا لباس اوڑھ کر اُس جیسا نظر آنا، گویا اداکاری بے شک نصیر الدین شاہ کر رہے ہوں، لیکن گمان بالکل غالب کا ہو!

لیکن حیرت انگیز طور پر جب میں نے اُس کی کہانی لکھنا شروع کی تو جیسے اُس نے بچپن سے جوانی کے حالات ایک ہی نشست میں سنائے، عین اسی طرح میں نے ایک ہی نشست میں لکھ ڈالے...... مجھے اس میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ایک وجہ تو اس کے بیان کی سادگی اور سلیقہ مندی بھی تھی۔ دوسری وجہ شاید یہ کہ کہانی کا ماحول کسی طرح سے بھی میرے لیے نیا یا اجنبی نہ تھا؛ بالکل ہی اپنے ماحول جیسا۔ اس کا گھر اپنے گھر، اس کے رشتے اپنے رشتوں، اس کا محلہ اپنے محلے جیسا ہی تھا۔ اس لیے میں کچھ یوں سنتا اور لکھتا چلا گیا کہ جیسے اپنی ہی کہانی لکھ رہا ہوں گویا۔

ہاں ایک جگہ آ کر میں رک گیا تھا...... ٹھٹک گیا تھا...... بات دل کی ہو، اور دل سے نکلے تو سیدھا دل پہ ہی آ کر لگتی ہے نا!

اُس کی شادی ایک ہی ادارے میں کام کرنے والے اُس کے ایک ہم عمر کولیگ سے ہی ہوئی تھی۔ اسی کی طرح شوخ مزاج اور سیدھا سادہ نوجوان۔ دونوں کی جوڑی خوب رہی۔ میں نے اس قضیے کا تذکرہ اُس سے جان بوجھ کر کیا۔ "......جوانی کی کوئی لغزش؟" کے جواب میں وہ اپنی روایتی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ ایک رَو میں کچھ یوں بولتی چلی گئی کہ میں نے اسے کہیں نہ ٹوکا، کچھ نہ پوچھا، دَم سادھے سنتا رہا...... بولنے کی سکت بھی کہاں تھی، یوں لگتا تھا کہ اپنی کہانی میں خود کو سنا رہا ہوں...... کردار کی جنس ہی تو بدلی تھی، باقی سب کچھ ویسا ہی تو تھا...... سو میں سنتا رہا، وہ بولتی رہی......

"......گھر پالنے کی ذمہ داری میں چھوٹی عمر میں ہی کچھ ایسی اُلجھی کہ جوانی کب آئی، کب گئی کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ ایک روایتی معاشرے کے پس منظر کے باعث اپنی حدود سے بھی آشنائی تھی، سو جوانی کے کسی ارمان نے سر اٹھایا بھی تو اسے دبا کر خاموش کر دیا۔ پھر کوئی ایسی نظر بھی نہ ملی کہ جو اندر تک جھانک کے دیکھتی، ہر نظر چہرے سے ہوتی ہوئی بدن کا ایکسرے کر لیتی، سو اپنے رویے میں جان بوجھ کر ایک سختی مخالف جنس کے لیے میں نے خود ہی پیدا کر لی تھی۔ 'نو انٹری' کا ایک

بورڈ میں نے اپنی نظروں میں ہی آویزاں کر دیا تھا۔ وہ تو رشتہ طے ہونے کے بعد جوانی کے ارمان مچلنے لگے تو برسوں کے سوئے ہوئے خواب جاگ اٹھے۔ موسیقی سننے کو، شعر پڑھنے کو جی کرنے لگا۔ ہونے والے جیون ساتھی کو سمجھنے، سمجھانے، اپنی بے پایاں محبت کے اظہار کی تمنا سر اٹھانے لگی...... انھی دنوں ایک ڈاکیومنٹری کے سلسلے میں سبی جانا ہوا۔ جون کی تپتی گرمی کے دن تھے۔ سنا تھا کہ یہاں ڈھاڈر کی پہاڑیوں پہ گواڑخ کے پھول اگتے ہیں۔ میں نے گواڑخ کا اب تک ذکر سنا تھا، دیکھا نہ تھا۔ بلوچستان کا یہ روایتی پھول پہاڑ کی چوٹی پہ اگنے کے باعث شہروں میں کم ہی دستیاب ہوتا ہے۔ میں نے گاڑی رکوائی۔ گواڑخ کا اتہ پتہ معلوم کیا۔ قریبی پہاڑی سے ہی آنے والی بھینی بھینی خوشبو اس کا پتہ دے رہی تھی۔ میں ایئر کنڈیشنڈ گاڑی سے نکل کر سبی کی جھلسا دینے والی ہواؤں میں، پہاڑی کی اور دوڑ پڑی......شہری اسٹائل کے نازک جوتوں نے پہاڑی کے سفر کے آغاز میں ہی ساتھ چھوڑ دیا۔ میں نے جوتوں کو بغل میں دبایا، اور پا پیادل پہاڑی پہ چڑھتی رہی۔ یوں لگتا تھا پیروں تلے انگارے بچھے ہوں۔ لیکن گواڑخ کے کچھ پھول لے کر جب واپس آئی تو پیروں کے چھالوں کی آگ کو بھول ہی گئی۔ یہ گواڑخ ہونے والے جیون ساتھی کو میرے دل کا پیغام پہنچا دیں گے، یہ اطمینان فی الوقت ہر کرب پہ بھاری تھا......کوئٹہ واپس آ کر میں نے ان پھولوں کو سجا کر آفس کے کچن میں موجود فریج میں رکھ دیا، اور اُس کے موبائل فون پہ پیغام چھوڑ دیا کہ 'تمہارے لیے ایک سرپرائیز ہے، دیکھ کر بتانا کیسا لگا!' اس نے یہ کہہ کر حامی بھر لی کہ اسے اشتیاق رہے گا۔ اگلے روز تک اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے جا کر فریج میں دیکھا تو پھول وہیں موجود تھے۔ میرے ارمانوں پہ گویا اوس پڑ گئی۔ لیکن پھر بھی مجھے لگا کہ شاید ہو سکتا ہے اس نے دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیے ہوں۔ میں نے اس کے فون پر میسج لکھا کہ سرپرائیز کیسا لگا؟ اس کا جواب آیا، ارے میں تو بھول ہی گیا تھا، ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ لیکن اگلے روز تک اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے ایک بار پھر جا کر دیکھا، پھول وہیں پڑے پڑے مرجھا گئے تھے......لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی یاد کر کے معذرت کا ایک لفظ نہ کہا۔ میں جب مرجھائے ہوئے گواڑخ اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینکنے لگی تو میرے پیروں کے چھالے جل اُٹھے......دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی بس!''

گہری آنکھوں کا دکھ بول اٹھا تھا اُس دن گویا!

مجھے سسّی یاد آئی، جو پنھوں کے لیے کچ کے تپتے صحرا میں پا پیادل محوِ سفر رہی...... سوہنی یاد آئی جو کچے گھڑے کی حقیقت سے آشنا ہوتے ہوئے بھی منجھدار میں کود پڑی...... سسّی اور سوہنی اب ایک روایت سہی پر اُن کی ہم جنس اب تک اُن کی روایت نبھا رہی ہے...... میں نے سسّی اور سوہنی کو مبارک باد دی!

بات ختم کرتے ہوئے وہ بس روئی تو نہیں، لیکن آنکھیں تھیں کہ چھلکنے کو بے تاب۔ مجھ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہ تھی، سو میں نے نظریں جھکا لیں۔

''گوارُخ مرجھانے نہیں چاہئیں...... جو دوسروں کے خلوص کے پھول مرجھا دیں، اُن کے ارمانوں کے پھول کیوں کر کھل سکتے ہیں!''

میں نے یونہی خود کلامی کی تھی شاید!

لیکن یہ واقعہ میں نے اُس کی داستان میں شامل نہ کیا...... پتہ نہیں کیوں!

اور پھر یوں ہوا کہ یہ ملاقات اور یہ کہانی بس یہاں تک ہی محدود رہی۔ جلد ہی وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر گھر داری تک محدود ہو گئی۔ اتفاق سے انھی دنوں اس کی سالگرہ کا دن آ گیا۔ مجھے لگا کہ کیوں نا ایک مایوس لڑکی کی خواہشوں کے گوارُخ کھلانے کی اپنی سی ایک کوشش کی جائے۔ میں نے اس کے لیے شاعری کی ایک اچھی سی کتاب تلاش کی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بچپن سے شعر لکھنے کی کوشش کرتی تھی، اس نے اپنا قلمی نام تک رکھا تھا لیکن اس کے شعروں پر جیون ساتھی کی جانب سے مذاق اڑائے جانے پر دل گرفتہ ہو کر وہ اس تخلیقی عمل سے بھی دست بردار ہو گئی تھی۔ سو میرا خیال تھا کہ اچھے شعروں کا مطالعہ شاید اسے پھر سے اس تخلیقی سرگرمی سے جوڑ دے۔ نیز کہیں سے کوشش کر کے میں نے گوارُخ کا ایک پھول حاصل کر لیا۔ مجھے اس کے لیے تپتی گرمی میں پا پیادل کسی پہاڑی کا سفر تو نہ کرنا پڑا لیکن تلاشِ بسیار اور خلوصِ دل میں کوئی کمی نہ رہی تھی۔

سالگرہ والے دن جب میں نے اُس سے فون کے ذریعے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ گھر والوں کی جانب سے تقریب کے باعث اُس سے ملاقات ممکن نہ ہوگی۔خیر میں نے اُس تک مبارک باد پہنچا دی اور یہ اطلاع بھی کہ اُس کا ایک سرپرائز گفٹ اُس کا منتظر ہے۔تحفے کا سن کر وہ بچوں کی طرح کھل اٹھی،اور کہا کہ تحفہ حاصل کرنے کے لیے تو وہ جلد ہی ملے گی؛'کل ہی ملتے ہیں نا......'لیکن یہ کل کئی دنوں تک ٹلتی رہی۔اُن دنوں تعطیلات کے دوران مجھے گاؤں جانا پڑا۔اِس دوران میں بھی اس قصیے کو بھول ہی بیٹھا،اس نے بھی کوئی سلسلہ بحال رکھنا یاد کیا۔

یوں کہانی بس ادھوری رہ گئی......

اور شاید یہ کہانی یہیں ختم ہی ہو جاتی لیکن شاید اس کا اختتامیہ ابھی باقی تھا......

گاؤں سے واپس آکر کتابوں کے شیلف میں کسی کتاب کی تلاش کے دوران اچانک میری نظر اُس لفافے پر پڑگئی۔لفافے سے جھانکتا ہوا خوب صورت کاغذ میں لپٹا ایک تحفہ۔میں نے جونھی لفافہ اٹھایا،گوا رُخ کا ایک مرجھایا ہوا پھول میری آغوش میں آگرا۔ایک بھولی بسری کہانی، پل میں نظروں میں آگئی،اور پھر تمام تر جزئیات کے ساتھ ذہن کی اسکرین پر کسی ویڈیو کی مانند چلتی ہی چلی گئی......

''گوا رُخ مرجھانے نہیں چاہئیں......جو دوسروں کے خلوص کے پھول مرجھا دیں،اُن کے ارمانوں کے پھول کیوں کر کھل سکتے ہیں!''

میں نے اپنی ہی خود کلامی کی بازگشت سنی تھی شاید!

اور جب مرجھائے ہوئے گوا رُخ میں ڈسٹ بن میں پھینک رہا تھا تو نجانے کیوں مجھے ایک پل کو لگا کہ جیسے پیروں تلے کسی نے انگارے بچھا دیے ہوں،جیسے پیروں میں پڑے چھالے جل اٹھے ہوں......دل میں اک ہوک سی اٹھی تھی بس!

میں نے سسی اور سوہنی سے معذرت کرلی۔

ٹوٹے مصرعوں سے جڑتی کہانی

وہ میری محبوبہ نہ تھی......

میں اس کا عاشق نہ تھا......

ہم کتاب کی راہوں میں، لفظوں کی چھاؤں میں، محبت کی چاہ میں اور وفا کی راہ میں یوں ہی ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔

سو کتاب، محبت اور الفاظ ہمارے تعلق کی مشترکہ اساس تھے، میراث تھے۔

'تعلق' جو اب تک کسی رشتے میں ڈھلنے نہ پایا تھا......'رشتہ' جو تھا ایک خواب کی مانند......اور وقت سراب کی مانند......ڈھلتا جاتا تھا، شباب کی مانند......

وہ کتابوں کی ایک نمائش تھی، جہاں وہ میری کوئی کتاب لیے میری جانب سرک آئی تھی......ایک عجب مہک آئی تھی۔

وہ آئی تھی پہلو میں الطافات لیے، اور میں...... نئے تعلقات کے معاملے میں وہی سدا کے تکلفات لیے......

سو فاصلے، حوصلوں میں نہ ڈھل سکے......

ہم مل کر بھی نہ مل سکے!

دونوں مگر چوں کہ کتاب کی چھاؤں میں تھے، محبت کی پناہوں میں تھے...... فاصلہ تادیر ممکن نہ تھا۔ آخر قریب آنا ہی تھا۔

اس قربت کا سبب پھر کہانی بنی۔ وہی مشترکہ نشانی بنی۔

اس نے اپنی کہانی سنائی، میں نے اپنی دہرائی۔ یہ محبت کی سادہ کہانیاں تھیں؛ ہجر، فراق، وفا، دھوکہ جن میں مشترکہ نشانیاں تھیں۔

بس کردار مختلف تھے، اعمال یکساں تھے۔ کہانی ایک سی تھی، نشانِ زوال یکساں تھے۔

یہ مشترکات، قربت کا سبب بننے لگے، نئی کہانی کے خال وخد بننے لگے!

شہر اس روز برف کی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ شہر کا کونا کونا یخ بستگی سے مہک اٹھا تھا۔ برف، روئی کے گالوں کی طرح زمین پہ اتر رہی تھی، جیسے کہ چاندنی کسی حسینہ کے رخ پہ بکھر رہی تھی۔

ایسی یخ بستگی کہ جو کسی گرم پہلو کی متقاضی تھی...... وہ فریب خوردہ مگر ایسی قربت کو کہاں راضی تھی!

دل کہ اک پیاسے دل کو فغاں دیتا تھا، گویا صحرا میں اذاں دیتا تھا......

یہاں دل بلاتا تھا اور آنکھ کے گوشے بھرے ہو جاتے تھے، وہاں دل جھجکتا تھا اور ماضی کے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔

وہاں جو دل ٹھٹکا، یہاں دل پہ چوٹ آئی............ سو فریب کی صورت دل نے اپنے ہی ٹوٹنے کی قسم کھائی۔

یوں دل سے جو فغاں نکلی تو اثر کر گئی، اس کے بھی دل میں گھر کر گئی۔

ایسے میں آخر بصد اصرار وہ اپنا گرم داماں لیے آئی، یخ بستگی میں شعلگی کا ساماں لیے آئی۔
اک ترسے ہوئے دل نے، اک فریب خوردہ دل کا اہتمام کیا۔ دل بستگی کا ہر ممکن
انصرام کیا۔

ایک دوسرے کے زخم سہلائے گئے۔ دل، دل سے ملائے گئے۔
باہر برف پڑتی رہی، اندر آگ سلگتی رہی۔
وہ آگ کہ جس میں ماضی راکھ ہوا، اور اس راکھ سے ایک نیا آغاز ہوا۔
دن کی سپیدی شام میں ڈھلنے لگی، تو کہانی نئے خال وخد بُننے لگی۔
کہانی، رات بھر دونوں کے اندر ننگے پاؤں چلتی رہی، خالی جگہیں بھرتی رہی۔

صبح ایک نئے ڈھنگ سے طلوع ہوئی۔ ایک نئے ڈھب سے شروع ہوئی۔
سورج طلوع ہوا تو رفتہ رفتہ برف کی چادر ڈھلنے لگی، جیسے دلوں پہ جمی کائی اترنے لگی......
سب کچھ نکھرا نکھرا سا ہوگیا، نیا تازہ سا ہوگیا۔

وقت کا دائرہ گھٹ رہا تھا، دلوں پہ جبر کا موسم چھٹ رہا تھا۔

کہ ایسے میں نوروز آپہنچا......
پھولوں کے کھلنے اور دلوں کے ملنے کا موسم آپہنچا۔
میں اس کی سالگرہ کا تحفہ سوچ رہا تھا، کچھ کھوج رہا تھا۔

پرندے چہچہانے لگے تو میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا، اور باہر جھانکا......
دیکھا......
پھولوں پہ نئے غنچے پھوٹ رہے تھے، جیسے شگوفے چھوٹ رہے تھے۔

ہر سُو تازگی نکھر رہی تھی......

نئی کہانی ابھر رہی تھی......

آفتاب کی روشنی نے گلاب کی پتیوں کو آلیا...... تو میں نے فطرت کا پیغام پالیا!!

خط میں سانس لیتی محبت

میری پیاری!

تمھارے حصے کی کہانی اتنی ہی پیاری ہے جتنی تم خود ہو۔تمھارے پیار کی طرح اسے کہیں سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے،تمھارے بدن کی طرح اسے کہیں بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔

تو تم جاننا چاہتی ہو، میں تمھارے متعلق کیا سوچتا ہوں؟

اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ میں تمھارے لیے وہی سوچتا ہوں جو ایک مرد کسی بھی لڑکی کے لیے سوچ سکتا ہے۔مگر مجھے پتہ ہے اتنا سادہ جواب تمھیں مطمئن نہیں کرسکتا۔سو آج میں وہ سب سناتا ہوں جو تم سننا چاہتی ہو۔

منو پیاری' کیا تم جانتی ہو ایک مرد کے لیے سب سے برا احساس کیا ہوتا ہے؟..........

محبت میں ٹھکرائے جانے کا احساس۔ایک مردانہ احساسِ برتری والے سماج میں انا، حیا اور زعم کے مارے مرد کو کوئی عورت ٹھکرا دے تو اس کے لیے موت کی مانند ہوتا ہے۔میں بھری جوانی میں ایسی ہی موت کا شکار ہو چکا تھا۔کون جانتا تھا مگر کہ بارہ برس بعد میں اُسی قاتل کے ہاتھوں پھر سے مرنے لگوں گا تو کوئی مسیحا آکر مجھے بچالے گی اور نئی زندگی بخش دے گی!

بارہ برس بعد مجھے ٹھکرائے جانے کا احساس دلانے والی دوبارہ سامنے آئی تو میں پھر سے خود کو مرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ایسے میں خدا جانے تم کہاں سے رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں اور میری ٹوٹتی

نبضوں کا بحال کیا۔ میں جیسے پھر سے جی اٹھا۔

اور تمھیں پتہ ہے ایک مرد کے لیے سب سے بڑا احساس کیا ہوتا ہے؟........... چاہے جانے کا احساس!! تم کہہ سکتی ہو وہ تو دنیا کے ہر انسان کے لیے ایک انمول احساس ہے۔ لیکن شاید تمھیں اندازہ نہ ہو کہ ملکیت کا احساس رکھنے والے مردانہ معاشرے میں مرد کے لیے کسی جوان جسم پہ اختیار اسے ایک عجب سی سرشاری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خصوصاً جب ایک ٹھکرائے ہوئے شخص کو کوئی اپنا لے تو وہ اپنے زخم بھول کر نئی بلندیوں کا سفر کرنے لگتا ہے........... یہی تم نے میرے ساتھ کیا۔

جانتی ہو، اس سے پہلے بھی مجھے محبت کا احساس ملا، مگر اس احساس میں محبت کم اور ہمدردی زیادہ ہوتی تھی۔ میرے زخموں پہ نمک کے بہانے دراصل کسی کو اپنے زخم چھپانے ہوتے تھے۔ میری کچھ محرومیوں کا ازالہ کرنے کے پیچھے اپنی کچھ محرومیوں کو چھپانا ہوتا تھا۔ یوں وہ تعلق لین دین کا معاملہ بن گئے۔ مجھ سے ہمدردی کر کے، ہمدردی چاہی گئی۔ میرے زخموں کا ازالہ کر کے، مجھ سے اسی مرہمی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس لیے میں ایسے تعلقات سے اوب گیا۔

تمھارا مزاج ہی عجب تھا........... کوئی مطالبہ نہیں، کوئی دعویٰ نہیں۔ بس چاہے جانے کا ایک حسیں احساس۔ تم نے حیران کر دیا کہ تمھیں ایک رائٹر سے رومانس کے سوا کچھ نہیں چاہیے جو تم پہ کہانی لکھ کر امر کر دے۔ جو تمھیں شدت سے چاہے اور اسی شدت سے چاہا جائے۔ میں نے پہلی بار تمنا کی کہ کاش مجھے وہ قلم مل جائے جو تمھاری محبت کی اس چاہ کو امر کر سکے۔ جو تمھاری کہانی کو یوں بیان کر سکے کہ سننے والے مبہوت رہیں اور ایسی چاہت کی تمنا کریں، جیسی تم سے مجھے نصیب ہوئی۔

اس نصیب کا کیا کہنا...... جس نے پورا نصیب ہی بدل ڈالا۔ تم نے ثابت کیا کہ ایک عورت کی محبت انسان کا نصیب بدل سکتی ہے۔ ایک عورت کی محبت میں اتنی طاقت ہے کہ کسی بھی مرتے ہوئے انسان کو بچا سکے، اسے زندگی کی طرف واپس لا سکے۔ اسے ہارے ہوئے جواری سے ایک کامیاب انسان بنا سکے۔ ایک محبت کیا کچھ نہیں کر سکتی! توقعات سے ماورا محبت کیا کچھ نہیں کر سکتی!

یہ میں نے تم سے ہی سیکھا کہ محبت توقعات سے ماورا بھی ہو سکتی ہے، بلکہ محبت توقعات سے ماورا ہی ہوتی ہے۔ توقع تو محبت کی موت ثابت ہوتی ہے۔ ہم جس سے پیار کرتے ہیں، اس سے

کئی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں، یہی توقعات کی دیمک رفتہ رفتہ تعلق کو چاٹ جاتی ہے اور اسے خستہ کر دیتی ہے۔ سو لازم ہے کہ جس سے محبت کی جائے، اسے توقع کی ڈور سے نہ باندھا جائے۔ محبت کا واحد مقصد بس محبوب کی خوشی ہے............ یہ میں نے تم سے سیکھا۔

میں نے یہ بھی تم سے سیکھا کہ پیار وہ جذبہ ہے جسے مکمل لٹانے کے بعد محبوب کی دہلیز پہ اپنا دل یوں رکھ کر لوٹ جانا چاہیے جیسے اچانک ہونے والی دستک پہ کوئی دروازہ کھولے اور اسے غیر متوقع طور پر اس کا پسندیدہ تحفہ ملے۔ میں نے تم سے سیکھا کہ پیار میں حیران کرنے اور بار بار حیران کر دینے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ میں نے سیکھا کہ مسرت وہ واحد جذبہ ہے جو پیار کی بنیاد ہے۔ جب تعلق میں مسرت کی مٹھاس نہ رہے تو جان لینا چاہیے کہ پیار کا برتن خالی ہو چکا ہے۔

اس لیے اے میری اچھی استاد! آج اس تعلق کی سالگرہ پہ تم سے بس اتنا کہنا ہے کہ میں تمھارے متعلق جتنا بھی سوچتا ہوں، وہ تمھارے ساتھ ہی سوچتا ہوں، تمھارے بنا زندگی کو سوچنے کا کوئی تصور نہیں۔ میں چاہتا ہوں مجھ پر تمھارے پیار کا سایہ یونھی دائم رہے جیسے پلکیں، آنکھوں پہ سایہ کیے رہتی ہیں۔

اس لیے مجھے جتنا چاہو حیران کرتی رہو مگر اچانک لوٹ جانے والی حیرت شاید قابل برداشت نہ ہو۔ جب بھی جانا چاہو تو میرے دل کی دہلیز پر 'دروازہ کھلا رکھنا' کا پوسٹر چسپاں کرنا مت بھولنا۔ اور تم بھول بھی جاؤ تو یہ دروازہ کھلا ہی رہے گا............ اس امید پہ کہ اس دہلیز پہ دھرا جو دل دھڑک رہا ہے، اس میں تمھاری ہی دھڑکنیں ہیں۔ جو آنکھیں رستہ تک رہی ہیں، ان میں تمھارے ہی خواب ہیں۔ تمھارے بنا ان آنکھوں کے سبھی خواب ادھورے رہیں گے۔ تمھارے بنا اس دل کی دھڑکن بے جان رہے گی۔

"تم چلی جاؤ گی، پرچھائیاں رہ جائیں گی!"

ان پرچھائیوں میں بھی مگر تمھارا ہی سایہ لہراتا رہے گا......

میں بس اتنا سوچتا ہوں!

******

یارم!

میں عام سی لڑکی ہوں۔۔۔میں نے تمہارے لفظوں سے پیار کیا۔۔۔اور یہ لفظوں کا سحر نشے میں تبدیل ہوا۔۔۔نشہ تمھیں چاہنے کا تمھارے قریب رہنے کا۔۔۔اور پھر تم اپنے لفظوں کی طرح مجھ میں اترتے گئے۔اور آہستہ آہستہ مجھ میں گھل مل گئے۔اور میں؟ میں جیسے تم پہ کھل گئی۔

آج میں جو ہوں میں یوں نہ تھی!! ہاں میں اتنی حسین پہلے تو نہ تھی یارم۔۔۔تم نے مجھے تراشا مجھے دیوی بنا کر چاہا۔۔۔

تم نے کہا کہ چاہے جانے کا احساس دنیا کا خوبصورت ترین احساس ہے، ہاں مگر چاہنا کیسا دلکش ہے۔۔۔۔یہ تم نے ہی سکھایا۔

مجھے زمیں سے اٹھا کر ہواؤں سے باتیں کرنا تم نے ہی سکھایا۔

ہنسی ہمیشہ بامعنی نہیں ہوتی ہے!!

خوشی بانٹنے سے اور بڑھتی ہے!!

یہ سب تم نے ہی تو سکھایا۔۔۔

آج جب سوچتی ہوں کہ دو سال پہلے میں کیا تھی اور کہاں کھڑی تھی۔۔۔تو لگتا ہے جیسے۔۔۔میرا جنم ہی نہ ہوا تھا۔جیسے زندگی کے رنگ بکھرے پڑے تھے اور۔۔۔اور پھر تم نے میرا ہاتھ تھاما۔۔۔اور ہم نے ملکر ایک خوبصورت تصویر بنائی۔۔۔

ہماری تصویر۔۔۔

مختلف رنگوں سے بھری۔۔۔انمول جذبات سے بھری۔۔۔

جس میں دور دور تک کہیں اداسی نہیں، کہیں خلش نہیں۔۔۔جہاں پیار ہے اپنائیت ہے، محبت ہے، رومانس ہے۔۔۔نیا پن ہے۔۔۔اور جب یہ تصویر مکمل ہوئی تم نے مجھے بانہوں میں لے کر کہا،"ہانی! تم نے مجھے مکمل کر دیا!"

اور اب میں تمہارا ماتھا چوم کر کہتی ہوں۔۔۔۔ہم مکمل ہوئے، ہم سرشار ہوئے۔

عابد میر کی کہانیاں

کہانی صلیب پر
کالمی کہانیاں

جدائی کا پیش لفظ
پریم کہانیاں

جنگ، محبت اور کہانی
جنگی کہانیاں

سرخ حاشیے
مختصر کہانیاں

دورنگی
دورنگی کہانیاں

دیگر تصانیف و تالیف

ادب

نصیر خوش کلام (تنقید) — گل خان نصیر کی اُردو شاعری کا فنی و فکری جائزہ

صحافت

خانہ بدوش کی محفل (بلوچستان کا عکس)	فیچر
خانہ بدوش کے خواب	کالم
بلوچستان اور جدید ذرائع ابلاغ	مضامین

تراجم

سلگتا بلوچستان	منتخب مضامین	(سندھی، انگریزی)
نواب اکبر بگٹی کی شہادت	منتخب مضامین	(سندھی، انگریزی)
قومی سوال کا مارکسی تناظر	منتخب مضامین	(سندھی، انگریزی)
آرٹ آف وار	سن زُو	(انگریزی)
رسل کے رومان	برٹرینڈ رسل	(انگریزی)
وفا کے موتی	محبت نامے	(انگریزی)
دکھ کی مسافت	حمیدہ گھانگھرو	(یادداشتیں۔سندھی)
باتیں ہماری یاد رہیں گی	جام ساقی	(یادداشتیں۔سندھی)
بوتیک سے بیڈ روم تک	اکبر سومرو	(افسانے۔سندھی)
بلوچستان اور میڈیا	منتخب مضامین	(انگریزی)

مُرتبہ

شاہ محمد مری

بلوچی لوک ادب

اُردو دوست

عابد میر کی کہانیاں
جدائی کا پیش لفظ
عابد میر
کہانی صلیب پر
عابد میر
سرخ حاشیے
عابد میر
جنگ، محبت اور کہانی
عابد میر
Rs:300